مئی ۱۹۹۴ ، شمارہ ۲۱۰

الرسالہ
Al-Risala

زیر سرپرستی
مولانا وحیدالدین خان
صدر اسلامی مرکز



MOSQUE AT EDIRNE, TURKEY

صبر بامقصد انسان کا کردار ہے۔ بامقصد انسان اس کا
تحمل نہیں کر سکتا کہ وہ بے صبر اور بے برداشت ہو جائے

INDIAN MUSLIMS

The Need For A Positive Outlook

By Maulana Wahiduddin Khan

Man must run the gauntlet of adversity in this life, for that is in the very nature of things. But repeated emphasis on the darker side of life, with no mention of brighter prospects ahead can lead only to discouragement, depression and inertia. The better way to find solutions to the problems besetting us would be to seek out and lay stress on whatever opportunities present themselves, so that those upon whom fortune has not smiled may feel encouraged to take the initiative in improving themselves and their lot in life.

In the light of concrete realities, this book focuses, therefore, on how, in entering upon the more positive avenues open to them, Muslims may avail themselves of the same kind of opportunities right here in India as they would find at any other point on the globe. For them treading this path is treading the path of wisdom.

Price Rs. 175 (Hardbound)
Rs. 65 (Paperback)

ISBN 81-85063-80-X (HB)
ISBN 81-85063-81-8 (PB)

Published by
AL-RISALA BOOKS
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013
Tel: 4611128 Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

مئی ۱۹۹۴ ، شمارہ

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax : 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 ☐ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)
Printed by Nice Printing Press, Delhi

صبر کی اہمیت

قرآن میں صبر کی غیر معمولی عظمت بیان ہوئی ہے۔ صبر کو اولو العزم پیغمبروں کا طریقہ بتایا گیا ہے (الاحقاف ۳۵) صبر پر اعلیٰ ترین کامیابیوں کی بشارت ہے (الاعراف ۱۳۷) صبر قیادت عالم کا زینہ ہے (السجدہ ۲۴) صبر حفاظت کا یقینی ذریعہ ہے (یوسف ۹۰) حتیٰ کہ صبر وہ چیز ہے جو آدمی کو بے حساب اجر کا مستحق بناتا ہے (الزمر ۱۰)

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی شخص کو صبر سے بہتر اور صبر سے بڑا عطیہ نہیں دیا گیا (وما اعطی احد عطاء خیراً و اوسع من الصبر) عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کا سب سے بہتر صبر کے ذریعہ پایا (وجدنا خیر عیشنا بالصبر) ابن حجر العسقلانی نے صبر کی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صبر تمام اچھے اخلاق کا جامع ہے (فالصبر جامع لمکارم الاخلاق) فتح الباری ۱۱/۲۰۹ - ۲۱۱

صبر نہ بزدلی ہے اور نہ وہ بے عملی ہے۔ صبر ایک مثبت قدر ہے۔ صبر بلند ترین ذہنی حالت ہے۔ صبر سب سے بڑا عمل ہے۔ صبر انسانیت کا تکمیلی درجہ ہے۔

آپ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں، کچھ لوگ آتے ہیں اور آپ کے خلاف اشتعال انگیز نعرہ لگادیتے ہیں۔ اب آپ کے لیے رد عمل کے دو مختلف طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ نعرہ کو سن کر بھڑک اٹھیں۔ آنے والوں کے ساتھ جھگڑنے لگیں۔ یہ بے صبری کا طریقہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اشتعال انگیز نعرہ کو سنیں مگر آپ اس پر مشتعل نہ ہوں، آپ کا ذہن بدستور اعتدال کی حالت پر باقی رہے۔ آپ اپنے جذبات کو تھام کر یہ سوچیں کہ ایسے موقع پر آپ کو کیا کرنا چاہیے۔ یہ دوسرا طریقہ صبر کا طریقہ ہے۔

بے صبری بھی عمل ہے، اور صبر بھی عمل ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی بے عملی نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بے صبر آدمی فوری جذبات کے تحت اقدام کر بیٹھتا ہے، خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ اس کے برعکس صبر والا آدمی سوچ سمجھ کر اور مشورہ کر کے اپنے اقدام کا فیصلہ کرتا ہے۔ بے صبری کی روش تباہی کی طرف لے جاتی ہے اور صبر کی روش کامیابی کی طرف۔

صحیح رخ

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ما رأیت مثل النار نام هاربها و ما رأیت مثل الجنة نام طالبها۔ حدیث میں ہارب نار (جہنم سے بھاگنے والا) اور طالب جنت (جنت کا چاہنے والا) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ اسلوب بہت بامعنی ہے۔ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ آدمی کی تخلیق اس ڈھنگ پر کی گئی ہے کہ وہ عین اپنی فطرت کے اعتبار سے ہارب جہنم اور طالب جنت بنے۔ اگرچہ اپنی فطرت سے انحراف کرکے وہ اس سے مختلف انسان بن جاتا ہے۔

انسان تکلیف کو برداشت نہیں کر پاتا۔ کسی بھی قسم کا دکھ انسان کے لیے آخری حد تک ناپسندیدہ چیز ہے۔ اس کے بجائے انسان کا حال یہ ہے کہ وہ راحت کو دل وجان سے چاہتا ہے، وہ خوشی اور لذت کا انتہائی حد تک دلدادہ ہے۔ چنانچہ اس کی پوری زندگی انھیں دو چیزوں کے گرد گھومتی ہے۔ یعنی مصیبت سے اپنے آپ کو بچانا اور دنیا کی راحت کو اپنے لیے جمع کرنا۔

مگر یہ حقیقت پسندی کے خلاف ہے۔ ساری تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لیے نہ تو یہ ممکن ہے کہ وہ تکلیف اور مصیبت سے اپنے آپ کو مکمل طور پر بچالے۔ اور نہ کسی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ راحت اور خوشی کو حقیقی معنوں میں اپنے لیے حاصل کرلے۔ آدمی ساری زندگی اسی کی دوڑ دھوپ میں لگا رہتا ہے۔ مگر آخر کار اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ مصیبتوں سے محفوظ زندگی حاصل کرتا ہے اور نہ آرام وراحت کی دنیا اپنے لیے بنا پاتا ہے۔

ایک طرف انسان کا یہ جذبہ ہے اور دوسری طرف موجودہ دنیا میں اس کا ناقابل حصول ہونا، ان دونوں باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس جذبہ کا اصل رخ آخرت کی طرف تھا۔ مگر انسان نے انحراف کرکے اس کو دنیا کی طرف موڑ دیا۔

انسان کی فطرت ہر لمحہ پکار رہی ہے کہ اے شخص تو ہارب جہنم اور طالب جنت بن۔ کامیاب وہ ہے جو اس آواز کو سن کر اس کی پیروی کرے۔ ناکام وہ ہے جو اس آواز کو نہ سنے اور آخر کار ابدی مایوسی کے گڑھے میں جا گرے۔

قدردانی

قرآن کی سورہ محمد (آیت ۲۴) میں کہا گیا ہے کہ کیا یہ منافقین قرآن پر تدبر نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر ان کے تالے لگے ہوئے ہیں۔ اس آیت کے ذیل میں تفسیروں میں ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے:

عَنْ هِشَام بن عُرْوَة عَنْ أَبِيهِ، قَالَ تَلَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا (أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا) فَقَالَ شَابٌّ مِنْ أَهْلِ الْيَمَنِ بَلْ عَلَيْهَا أَقْفَالُهَا حَتَّى يَكُونَ اللهُ تَعَالَى يَفْتَحُهَا أَوْ يُفْرِجُهَا۔ فَمَا زَالَ الشَّابُّ فِي نَفْسِ عُمَرَ حَتَّى وَلِيَ فَاسْتَعَانَ بِهِ (تفسیر ابن کثیر ۴/۱۸۰)

ہشام بن عروہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز یہ آیت تلاوت فرمائی (کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر اس کے تالے ہیں) یہ سن کر یمن کے ایک نوجوان نے کہا ہاں، ان کے دلوں پر تالے ہیں، یہاں تک کہ خدا ہی ان تالوں کو کھول دے۔ اس نوجوان کی یاد برابر حضرت عمرؓ کے دل میں رہی۔ یہاں تک کہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے اس سے حکومت کے کام میں مدد لی۔

اسی صفت کا نام قدردانی ہے۔ کسی قوم یا کسی حکومت کا نظام اچھا رہنے کی ایک ضمانت یہ ہے کہ اس کے ذمہ دار لوگ افراد کی صلاحیتوں کو پہچانیں اور ان کی قدردانی کریں، وہ ایسے افراد کو ان کی صلاحیت کی نسبت سے کام کے مواقع فراہم کریں۔ ایسے کسی فرد کو وہ جہاں پائیں اس کو اس طرح اٹھا لیں جس طرح ایک جوہری راکھ میں پڑے ہوئے سونے کے ٹکڑے کو اٹھا لیتا ہے۔

اس کے برعکس جب ذمہ دار لوگوں کا حال یہ ہو جائے کہ وہ افراد کو اس اعتبار سے دیکھیں کہ وہ میرا رشتہ دار ہے یا اجنبی ہے۔ وہ میری تعریف کرتا ہے یا میرا ناقد ہے۔ وہ میرے گروہ سے تعلق رکھتا ہے یا میرے گروہ سے باہر کا آدمی ہے۔ وہ ہر معاملہ میں مجھ سے اتفاق رائے رکھتا ہے یا کسی معاملہ میں اس کی رائے مجھ سے مختلف ہے۔

کسی قوم یا کسی حکومتی نظام میں اول الذکر صفت والے اشخاص کا اختیار کے مناصب پر ہونا اس قوم یا حکومت کی ترقی کی ضمانت ہے۔ اس کے برعکس جس قوم یا حکومتی نظام میں ثانی الذکر صفت والے اشخاص اختیار کے مناصب پر قابض ہو جائیں، اس کو کوئی چیز تباہی اور بربادی سے بچانے والی نہیں۔

دینی تعلیم کا مقصد

حدیث میں آیا ہے کہ علم کو حاصل کرنا فرض ہے (ان طلب العلم فریضۃ) علم کی اسی اہمیت کی بنا پر اہل اسلام نے ہر دور میں دینی تعلیم کے ادارے قائم کیے۔ ان تعلیمی اداروں کی نوعیت کیا ہے، اس کو بتانے کے لیے قرآن کی حسب ذیل آیت بلاشبہہ ایک رہنما آیت ہے :

وما کان المومنون لینفروا کافۃ، فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔ (التوبہ ۱۲۲)

اور یہ ممکن نہ تھا کہ اہل ایمان سب کے سب نکل کھڑے ہوں، تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کر آتا تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرتا اور واپس جاکر اپنی قوم کے لوگوں کو آگاہ کرتا تاکہ وہ پرہیز کرنے والے بنتے۔

القرطبی نے لکھا ہے کہ طلب علم کے وجوب کے لیے یہ آیت اصل کی حیثیت رکھتی ہے (ھذہ الآیۃ اصل فی وجوب طلب العلم) اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم دین سے مراد حقیقۃً تفقہ فی الدین ہے۔ تعلیم دین کو جانچنے کا قرآنی معیار صرف ایک ہے۔ اور وہ خود قرآن کے لفظ میں، تفقہ ہے۔

القرطبی نے لیتفقھوا کی تشریح یتبصّروا کے لفظ سے کی ہے۔ یعنی تفقہ کا مطلب ہے بصیرت حاصل کرنا۔ الراغب الاصفہانی نے لکھا ہے کہ فقہ کا مطلب علم شاہد سے علم غائب تک پہنچنا ہے، اس طرح فقہ زیادہ خاص ہے علم سے (الفقہ ھو التوصل الی علم غائب بعلم شاھد فھو اخص من العلم) فقہ حاصل کیا کا مطلب ہوتا ہے فہم حاصل کیا (فَقِہَہُ ای فِہِمَہُ) لسان العرب میں ہے کہ فقہ اصل میں فہم کو کہتے ہیں (الفقہ فی الاصل الفہم)

اس سے معلوم ہوا کہ دینی مدارس کا اصل نشانہ کیا ہونا چاہیے۔ وہ یہ ہونا چاہیے کہ جو لوگ یہاں تعلیم و تربیت حاصل کر کے نکلیں وہ تفقہ فی الدین کی صلاحیت کے حامل ہوں۔ تفقہ سے مراد جزئیات دین کی مہارت نہیں ہے، بلکہ تفقہ سے مراد اساسات دین میں فہم و بصیرت ہے۔ خاص طور پر یہ صلاحیت کہ آدمی ظاہری معلومات کے ذریعہ باطنی حقائق تک پہنچنے کے قابل ہو جائے۔

فطرت سے انحراف

دلی کی ایک سڑک پر ایک تھری وہیلر ڈرائیور اپنا تھری وہیلر چلاتے ہوئے گزر رہا ہے۔ دوسری طرف سے ایک اور شخص اپنا اسکوٹر (ٹو وہیلر) چلاتے ہوئے آیا۔ اتفاق سے دونوں میں ٹکر ہوگئی۔ دونوں رک گئے۔ اسکوٹر سوار جو بظاہر ایک تاجر تھا، سخت غصہ میں آگیا۔ اس نے تھری وہیلر ڈرائیور کو ڈانٹتے ہوئے کہا: اندھے ہو، تم کو دکھائی نہیں دیتا.......

تھری وہیلر ڈرائیور دونوں ہاتھ جوڑ کر سڑک پر کھڑا ہوگیا۔ اس نے کہا کہ بابوجی، مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے اپنی گاڑی اور پہلے موڑنا چاہیے تھی۔ میں نے موڑنے میں دیر کر دی اس لیے ٹکر ہوگئی۔ اب آپ مجھ کو چھما کر دیں۔ آپ جو بھی سزا دینا چاہیں میں اس کو بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ تھری وہیلر ڈرائیور کے ان الفاظ نے آگ پر پانی کا کام کیا۔ اسکوٹر سوار کا غصہ فوراً ٹھنڈا ہوگیا۔ وہ تھوڑی دیر چپ ہو کر تھری وہیلر ڈرائیور کو دیکھتا رہا اور اس کے بعد بولا: اچھا جاؤ، اب کبھی ایسا مت کرنا۔

اس واقعہ پر غور کیجئے۔ اسکوٹر سوار جب غصہ میں تھا تو اس کے منہ سے دوسرے الفاظ نکلے اور جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا تو وہی آدمی چند منٹ بعد بالکل دوسرے الفاظ بولنے لگا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غصہ کے وقت آدمی اپنی حالتِ فطری سے ہٹ گیا تھا، جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ دوبارہ اپنی حالتِ فطری پر آگیا۔ آدمی اپنی حالتِ فطری پر ہو تو اس کے اندر سنجیدگی، اعتراف، اور انصاف پسندی کا جذبہ ہوتا ہے۔ لیکن جب کسی وجہ سے وہ اپنی حالتِ فطری سے ہٹ جائے تو اس وقت یہ تمام شریفانہ جذبات دب جاتے ہیں۔ وہ مصنوعی طور پر سرکشی اور انانیت جیسے جذبات کا معمول بن جاتا ہے۔

جب آپ کسی شخص کو دیکھیں کہ وہ آپ کے اوپر بگڑ گیا ہے، وہ آپ کے خلاف فساد برپا کرنا چاہتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ اپنی حالت فطری سے ہٹ گیا ہے۔ ایسے وقت میں اس آدمی سے ٹکرانا مسئلہ کا حل نہیں ہے بلکہ حل یہ ہے کہ اس آدمی کو اس کی حالتِ فطری کی طرف دوبارہ واپس لایا جائے۔ حالتِ فطری پر واپس آتے ہی وہ ایک نارمل انسان بن جائے گا اور پھر آپ کا مسئلہ بھی اپنے آپ حل ہو چکا ہوگا۔

سچّی ہوشیاری

حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ کی مسجد نبوی میں تھے۔ صحابہ کی ایک تعداد آپ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اتنے میں انصار کا ایک نوجوان آیا۔ نوجوان نے آپ سے کچھ سوالات کیے جن کا آپ نے جواب دیا۔ وہ سوال و جواب یہ تھا:

قال یارسول اللہ ایّ المومنین افضل۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احسنہم اخلاقا۔ ثم قال فایّ المومنین اکیس۔ قال اکثرہم للموت ذکراً واکثرہم استعدادا لہ قبل ان ینزل بہ اولٰئک ہم الاکیاس

اس نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مسلمانوں میں سب سے بہتر کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جس کے اخلاق سب سے بہتر ہوں۔ پھر اس نے پوچھا کہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ سمجھ دار کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جو سب سے زیادہ موت کو یاد کرے اور جو موت آنے سے پہلے سب سے زیادہ اس کی تیاری کرے۔ ایسے ہی لوگ سب سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔

جس شخص کا ایمان جتنا زیادہ گہرا ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کا اخلاق اچھا ہوگا۔ جس آدمی کے دل میں اللہ کا ڈر پیدا ہو جائے۔ وہ بندوں کے ساتھ سلوک کرنے میں انصاف کرنے والا اور مہربانی کرنے والا بن جاتا ہے۔ اور اسی کا دوسرا نام حسن اخلاق ہے۔

موت کو یاد رکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی دنیا کو عارضی اور آخرت کو ابدی سمجھتا ہے۔ وہ موجودہ دنیا کی چیزوں میں الجھ کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ آنے والی زندگی کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے ہوئے ہے۔ پھر اس سے زیادہ عقل مند کون ہو سکتا ہے جو ابدی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کے بارے میں سوچے اور اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لے۔

موت کی یاد کا یہ نتیجہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی موجودہ دنیا میں اپنے عمل کے بارے میں ہوشیار ہو جاتا ہے۔ یہ مزاج اس کے اندر سے بے اعترافی، ناانصافی، فریب، استغلال اور نمود و نمائش کے جذبات ختم کر دیتا ہے۔ اور جس آدمی کے اندر اس قسم کے غلط اور مصنوعی جذبات ختم ہو جائیں، اس کا ہر قدم صحیح سمت میں اٹھے گا، وہ ایک بے پناہ انسان بن جائے گا۔

اصحاب رسول

اسماعیل السدی کہتے ہیں کہ میں نے ابواراکہ تابعی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے علیؓ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی۔ پھر جب انھوں نے اپنے چہرہ کو داہنی طرف پھیرا تو وہ اس طرح ٹھہرے گویا کہ ان کے اوپر شدید غم ہو۔ وہ اسی طرح رہے یہاں تک کہ جب دھوپ مسجد کی دیوار پر ایک نیزہ کے برابر آگئی تو انھوں نے اٹھ کر دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر انھوں نے اپنے ہاتھ کو پلٹتے ہوئے کہا۔ خدا کی قسم میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو دیکھا ہے۔ آج میں کوئی بھی چیز ان کے مشابہ نہیں دیکھتا۔ ان کا حال یہ تھا کہ وہ خالی ہاتھ، پراگندہ بال اور غبار آلود ہوتے تھے۔ ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بکری کے گھٹنے جیسا نشان ہوتا۔ وہ اپنی رات کو سجدہ اور قیام میں گزارتے۔ ان کی آنکھیں آنسو بہاتیں یہاں تک کہ ان کے کپڑے بھیگ جاتے۔ خدا کی قسم، آج کے لوگوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی رات غفلت میں گزاری۔

مذکورہ روایت کے مطابق، خلیفہ چہارم علی رضی اللہ عنہ نے اصحاب رسول کی جو صفات بتائیں، ان میں سے ایک صفت یہ تھی کہ جب وہ صبح کرتے تو وہ اللہ کو یاد کرتے۔ اس وقت وہ اس طرح ہلتے جس طرح درخت ہوا چلنے کے وقت ہلتا ہے (فاذا اصبحوا فذکروا اللہ مادوا کما یمید الشجر في يوم الريح) البدایہ والنھایہ ۸/۶

حضرت علیؓ نے اپنے اس فقرہ میں اس حالت کو بیان کیا ہے جس کو جسم پر تھرتھری پیدا ہونا کہتے ہیں۔ اللہ سے ڈرنے والا انسان جب اللہ کو یاد کرتا ہے تو وہ کانپ اٹھتا ہے۔ اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے جسم کے اوپر مخصوص قسم کی تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ یہ تھرتھراہٹ کبھی صرف جسم کی اوپری جلد پر کپکپی طاری کر دیتی ہے، اور کبھی اتنی تیز ہوتی ہے کہ آدمی کا پورا جسم لرز اٹھتا ہے۔ اللہ کی یاد اصلاً آدمی کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ مگر جب یہ یاد زیادہ گہری ہو تو وہ آدمی کی روح کو اس طرح پگھلاتی ہے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اس کے جسم پر بجلی کی لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ اس کے پورے وجود پر ذکر خداوندی کا بھونچال طاری ہو جاتا ہے۔ اس کا جسم اسی طرح ہل جاتا ہے جس طرح تیز ہوا کسی درخت کو ہلا دے۔

شہر کی تعمیر

شکاگو (Chicago) امریکہ کا ایک شہر ہے۔ شکاگو کے لفظی معنی جنگلی پیاز (wild onion) کے ہیں۔ پہلے یہ شہر اپنی گندگی اور جرائم اور ناقص مکانات کے لیے مشہور تھا۔ اس لیے اس کا یہ نام پڑگیا۔ آج شکاگو ایک اعلیٰ درجہ کا خوب صورت شہر ہے۔

شکاگو کی جدید تاریخ رچرڈ ڈیلی (Richard J. Daley) کی طرف منسوب ہے۔ وہ ۱۹۰۲ میں پیدا ہوا، ۱۹۷۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ ۱۹۵۵ میں وہ شکاگو کا میئر منتخب ہوا، اور آخر عمر تک وہاں کا میئر رہا۔ میئر بننے کے بعد اس نے از سر نو شہر کا منصوبہ بنایا۔ اس نے قدیم شکاگو کو ہر اعتبار سے نیا شکاگو بنا دیا۔

رچرڈ ڈیلی کی کامیابی کا خاص راز یہ تھا کہ اس نے شکاگو کی تعمیر جدید کو وہاں کے باشندوں میں سے ہر ایک کا ذاتی مسئلہ بنا دیا۔ اس نے ہر ایک کے اندر یہ ذہن پیدا کیا کہ یہ کام مجھ کو کرنا ہے، اور میں ہی اس کو انجام دوں گا۔ اس نے شکاگو میں بسنے والے ہر ہر شخص کو یہ ماٹو دیا ——— میں اس کو کروں گا :

I will do it.

کسی بڑے تعمیری کام کے لیے یہ صحیح ترین ماٹو ہے۔ ہر آدمی کے اندر یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ جب وہ کسی معاملہ کو دیکھے تو وہ سمجھے کہ یہ میری ہی ذمہ داری ہے۔ یہ کام مجھ کو ہی انجام دینا ہے۔ اگر سوسائٹی کے ہر فرد کے اندر یہ جذبہ ابھر آئے تو اس کے بعد ہر منصوبہ کی تکمیل یقینی ہو جائے گی۔

شکاگو بظاہر ایک برا نام تھا۔ مگر اصل کام شہر کا نام بدلنا نہیں ہے بلکہ شہریوں کا مزاج بدلنا ہے۔ شہر کا نام بدلنا ایک بے نتیجہ کام ہے۔ لیکن اگر شہریوں کے مزاج کو بدل دیا جائے تو ایک تباہ حال شہر بھی ایک اچھا شہر بن جائے گا۔

دوسروں کے خلاف نعرہ سماج میں اکھیڑ پچھاڑ پیدا کرتا ہے۔ اپنے لیے نعرہ سماج کو ترقیاتی سرگرمیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ پہلے قسم کے نعرے سے لیڈر کی شخصیت بنتی ہے اور دوسری قسم کے نعرہ سے ملک بنتا ہے۔ پہلا نعرہ تخریب ہے اور دوسرا نعرہ تعمیر۔

ایک سفر

لاہور کے سفر کی بات بہت عرصہ سے چل رہی تھی۔ لاہور میں اسلام پسند نوجوانوں کا ایک حلقہ ہے۔ اس کی طرف سے مجھے سفر کی دعوت دی گئی۔ اس سلسلہ میں ۸۸ ۔ ۱۹۸۷ میں جناب نعیم بلوچ صاحب سے خط وکتابت ہوتی رہی۔ مگر کوئی قطعی پروگرام نہ بن سکا۔ آخر کار جناب کرامت اللہ شیخ صاحب کی دعوت پر پروگرام طے ہوگیا۔ خط اور ٹیلیفون کے ذریعہ تفصیلات کی بابت تبادلہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ طے پاگیا کہ میں ۱۹ ستمبر کو لاہور پہنچوں۔

۱۹ ستمبر ۱۹۹۱ کی سہ پہر کو میں دہلی سے لاہور کے لئے روانہ ہوا۔ آج کے ٹائمس آف انڈیا (۱۹ ستمبر) کے صفحہ اول پر وزیر اعظم ہند مسٹر نرسمہاراؤ کا ایک بیان چھپا تھا۔ اس کی سرخی یہ تھی ـــــ پاکستان سے معاملہ کرنے کے لئے تیار رہو:

Be ready to deal with Pakistan

ایرپورٹ پہنچ کر پی آئی اے کی فلائٹ نمبر ۲۷۱ کے اندر داخل ہوا۔ جہاز میں پاکستانی اخبارات پڑھنے کے لئے موجود تھے۔ لاہور کے روزنامہ جنگ (۱۹ ستمبر) کے صفحہ ۴ پر " بیرونی خطرات " کے عنوان سے ایک مضمون تھا۔ اس میں دوبارہ سابق چیف آف آرمی اسٹاف جنرل اسلم بیگ کا آخری بیان نقل کیا گیا تھا۔ " ہمارے وطن عزیز کی سرحدوں پر جنگ کے گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں "۔

روس اور امریکہ نے سپر پاور ہوتے ہوئے سرد جنگ اور گرم جنگ کو مکمل طور پر ختم کر دیا۔ اب دونوں کے درمیان کوئی بھی جنگ کی بات نہیں کرتا۔ یہ محض دو ملکوں کا فیصلہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک زمانی فیصلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب سرد جنگ یا گرم جنگ کا دور ختم ہوگیا۔ مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سپر پاور خواہ جنگی زبان بولنا بند کر دیں۔ مگر منی پاورز کے درمیان جنگی زبان کا رواج بدستور باقی رہے گا۔

دن کے ڈھائی بجے دہلی انٹرنیشنل ایرپورٹ پہنچا تھا۔ یہاں باہر اور اندر تقریباً سناٹے کا عالم نظر آیا۔ جب کہ رات کے وقت یہاں ہر طرف آدمیوں کا ہجوم دکھائی دیتا ہے۔ یہ ہندستان کی پسماندگی

کی قیمت ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ایرپورٹ پر دن کے وقت چہل پہل ہوتی ہے اور غیر ترقی یافتہ ملکوں میں رات کے وقت۔ ترقی یافتہ ملک اپنے شہریوں کی سہولت کے لئے رات کے وقت جہازوں کو اترنے یا روانہ ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ جدید دنیا میں ترقی یافتہ ملک کا باشندہ ہر جگہ برتر حیثیت میں ہوتا ہے اور غیر ترقی یافتہ ملک کا باشندہ ہر جگہ کم تر حیثیت میں۔

دنیا میں جو تقسیم ترقی اور بے ترقی کی بنیاد پر ہے، آخرت میں وہ تقسیم مزید اضافہ کے ساتھ صالح اور غیر صالح کی بنیاد پر قائم ہو جائے گی۔ موجودہ دنیا کی تقسیم علامتی صورت میں آخرت میں پیش آنے والے واقعہ کا اعلان ہے۔ مگر اس اعلان کو سننے کے لئے وہ کان درکار ہیں جو خاموش آوازوں کو اسی طرح سنیں جس طرح کوئی شخص لاؤڈ اسپیکر کی چیخ کو سنتا ہے اور اس کو سمجھ لیتا ہے۔

ایرپورٹ کے اندر انتظار گاہ میں ٹیلیفون لگے ہوئے ہیں جن پر لکھا ہوا ہے "فری ٹیلیفون" میں نے اپنے یہاں کا نمبر ڈائل کیا۔ ہمارے دفتر کے ٹیلیفون پر گھنٹی بجنے لگی۔ "ہیلو" کے تبادلہ کے ساتھ اگلے لمحہ دفتر سے ربط قائم ہو گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے "غائب" حیثیت رکھتے تھے، مگر ہم دونوں "حاضر" کی طرح باہم گفت گو کر رہے تھے۔

یہ ایک سادہ سا واقعہ ہے۔ مگر جب بھی ایسا ہوتا ہے تو میں سوچنے لگتا ہوں کہ جس دنیا میں "انسان غائب" سے رابطہ قائم کرنا ممکن ہو، وہاں "خدائے غائب" سے رابطہ قائم کرنا کیوں ممکن نہ ہوگا۔ بلاشبہ یہ ممکن ہے: ولکنّ اکثر الناس لا یعلمون۔

۴۵ منٹ کی پرواز کے بعد جہاز لاہور ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ پرواز اور لینڈنگ دونوں نہایت ہموار رہی۔ اندرونی سروس کا معیار بھی اچھا تھا۔ میں نے جب بھی پاکستان انٹرنیشنل سے سفر کیا ہے، اس کا معیار ہمیشہ اچھا پایا ہے۔ اس بار بھی مجھے ایسا ہی تجربہ ہوا۔

ہوائی اڈہ کے اندر عملہ کے ایک واقف کار آدمی نے میرا پاسپورٹ لے لیا اور رسمی کارروائیاں تیزی سے طے کرادیں۔ باہر نکلے تو عین ہوائی اڈہ کے سامنے سڑک کے دوسری طرف ایک سادہ اور خوبصورت مسجد تھی۔ ساتھیوں کی رائے ہوئی کہ نماز مغرب یہاں ادا کر لی جائے۔ اس کے بعد شہر کے لئے روانہ ہوں۔ چنانچہ مغرب کی نماز اسی مسجد میں ادا کی گئی۔

مسجد کی بیرونی دیوار پر لکھا ہوا تھا: واعتصموا بحبل اللہ جمیعا۔ یہاں اکثر ہوائی

مسافر تھے۔ جب مختلف ملکوں اور قومیتوں کے لوگ ایک امام کے پیچھے صف باندھ کر کھڑے ہوئے تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کہ وہ واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً کے حکم کی عملی تصدیق کر رہے ہیں۔ یہ کیسا عجیب سبق ہے جو مسجد کے ماحول میں مسلمانوں کو دیا جاتا ہے۔ اگر یہ سبق مسلمانوں کی پوری زندگی میں شامل ہو جائے تو ان کے اندر عظیم انقلاب آجائے۔

نماز پڑھ کر باہر نکلا تو مسجد کے گیٹ پر ایک صاحب ملے۔ انھوں نے اپنا نام محمد ظفر عادل بتایا۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک سنگین مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر جواب دینے لگے تھے۔ چنانچہ میرے اندر افسردگی (depression) کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ عین اس وقت اتفاق سے آپ کی کتاب "راز حیات" پڑھنے کو ملی۔ اس کو پڑھ کر میری حالت بالکل بدل گئی۔ میرے اندر نیا یقین جاگ اٹھا۔ جو کام دوا نہ کر سکی تھی وہ کام اس کتاب نے کر دیا۔

لاہور میں میرا قیام جناب کرامت شیخ کے یہاں تھا۔ شام کو یہاں مختلف اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب جمع ہو گئے۔ گیارہ بجے رات تک یہ مجلس جاری رہی۔ علمی انداز میں تبادلہ خیال ہوتا رہا۔

پاکستان کا اقتصادی مرکز کراچی ہے۔ اسلام آباد اس کا سیاسی مرکز ہے۔ لاہور کو پاکستان کے علمی اور تمدنی مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ لاہور اگرچہ قدیم شہر ہے۔ مگر اس کی قدیم تاریخ کے بارہ میں زیادہ معلومات حاصل نہیں۔ غزنوی خاندان نے ۱۱۵۲ء میں اس کو اپنی راجدھانی بنایا۔ اس وقت سے وہ باقاعدہ طور پر تاریخ میں ذکر کیا جانے لگا۔ ۱۳۹۸ میں اس کو تیمور کی فوجوں نے تباہ کر دیا تھا۔ مبارک شاہ نے ۱۴۲۲ میں دوبارہ اس کو آباد کیا۔ ۱۴۵۱ میں بہلول خاں لودی نے اس پر اپنی حکومت قائم کی۔

مغل حکمراں بابر کی فوجوں نے ۱۵۲۴ میں اس پر قبضہ کر لیا، اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷) کے بعد ۱۷۹۹ میں رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کر کے اس کو اپنی وسیع سلطنت کی راجدھانی قرار دیا۔ افغانی حکمراں شاہ زماں نے ۱۲ اپریل ۱۸۰۱ کو اعلان کیا کہ وہ رنجیت سنگھ کو لاہور کا گورنر تسلیم کرتا ہے۔ مگر رنجیت سنگھ نے اس حیثیت کو قبول نہیں کیا اور "مہاراجہ پنجاب" ہونے کا اعلان کر دیا۔ ۱۸۴۹ سے لاہور انگریزوں کی ماتحتی میں آگیا، ۱۹۴۷ سے وہ پاکستان کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے۔

آج اگر مکہ میں کوئی بڑا واقعہ ہو تو اسی دن اس کی خبر پنجاب کے اس شہر میں پہنچ جائے گی۔ مگر ساڑھے تیرہ سو سال پہلے دنیا کتنی مختلف تھی۔ ۶۳۰ء میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دس ہزار اصحاب کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور فاتحانہ طور پر مکہ میں داخل ہوئے۔ اسی ۶۳۰ء میں چینی سیاح ہوان سانگ (Hsuan Tsang) سفر کرتا ہوا شمالی پنجاب پہنچا۔ مگر اس کے سفرنامہ میں نہ لاہور کا ذکر ہے اور نہ فتح مکہ کا۔ قدیم دنیا اور جدید دنیا میں کتنا زیادہ فرق ہے۔

پچھلے نبیوں کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا ہے۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں میں علم کی زبردست روح پھونکی۔ اس کی وجہ سے دور اول ہی میں لوگوں نے علم اور ادب میں مہارت پیدا کی اور اسلامی واقعات کو کتابوں کی صورت میں مدون کیا۔ اس طرح اسلام کی تاریخ ماضی کے مذاہب کے برعکس، گم ہونے سے محفوظ رہ گئی۔

جس زمانہ میں میں لاہور میں تھا انھیں دنوں میں برطانیہ کی لیڈی ڈائنا لاہور آئیں۔ ۲۵ ستمبر کو انھوں نے لاہور کی بادشاہی مسجد کی زیارت کی۔ ہندستان ٹائمس (۲۷ ستمبر ۱۹۹۱) میں ایک تصویر چھپی ہے۔ اس میں ایک عورت سر پر دوپٹہ اوڑھے ہوئے اور ننگے پاؤں مسجد کے اندر چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ تصویر کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

A barefooted Princess Diana takes a walk inside historical Badshahi mosque on wensday during her one day visit to Lahore city.

لاہور کے روزنامہ امروز (۲۶ ستمبر) میں "شہزادی ڈائنا سے اسلامی ذہن کے مردوں کا مصافحہ" کے عنوان سے ایک دلچسپ نوٹ تھا۔ اس میں درج تھا کہ ـــــ دنیا نے پاکستان ٹیلی ویژن کے خبرنامہ میں یہ خوبصورت منظر بھی دیکھا کہ اعجاز الحق سمیت اسلامی ذہن کے وفاقی وزراء والہانہ انداز میں شہزادی ڈائنا سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ (دوسری طرف) ہمارے ملک میں جب کسی عورت کو اقتدار یا عروج حاصل ہوتا ہے تو لوگ ایسی تصاویر تلاش کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ جس میں اس خاتون نے کسی مرد سے ہاتھ ملایا ہو۔

"اردو زبان یہاں کے لوگوں کے لئے فیشن کی مانند ہے۔ وہ فخر کے ساتھ اردو بولتے ہیں اور اس کو بہت پسند کرتے ہیں" ایک صاحب نے کہا۔ میں نے اپنے تجربہ میں اس کو بالکل درست پایا۔

حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کے لوگوں میں اردو زبان کا تقریباً وہی درجہ ہے جو ہندستان میں انگریزی کا ہے۔ لوگوں کی پڑھنے لکھنے کی زبان اردو ہے۔ ہر موضوع پر اعلیٰ کتابیں اردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ معیاری قسم کے جرائد اردو زبان میں نکلتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کو کمپیوٹر کی سطح پر لانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ وغیرہ۔

پاکستان کے مسلمانوں میں ایک امتیازی خصوصیت پائی جاتی ہے جو ہندستان کے مسلمانوں میں نہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کے بچے عام طور پر انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ وہ اردو زبان سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس بنا پر ہمارے یہاں علماء اور جدید مسلم نسل کے درمیان ایک لسانی بعد (لینگویج گیپ) پایا جاتا ہے اور وہ صورت حال پیدا ہو گئی ہے جس کو فارسی شاعر نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے :

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

مگر پاکستان میں یہ صورت حال نہیں۔ وہاں اعلیٰ خاندان کے بچے بھی بخوبی طور پر اردو زبان جانتے ہیں۔ اس طرح ان کے اور علماء کے درمیان زبان کی دوری پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اگرچہ بعض تجربات کی بنا پر میں نے محسوس کیا کہ خود علماء کے غیر حکیمانہ رویہ کی بنا پر یہاں کی نئی نسل علماء کے طبقہ سے زیادہ مانوس نہیں۔

میں جس کالونی میں ٹھہرا تھا ، مجھے معلوم ہوا کہ اس کی مسجد کے امام صاحب کے لئے مسجد کی طرف سے باقاعدہ رہائش گاہ دی گئی ہے۔ اتفاق سے امام صاحب نے صبح کے ناشتہ پر مدعو کیا۔ اس طرح ان کی رہائش گاہ کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا۔

اس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ ایک صاف ستھرا فلیٹ تھا۔ جس کا کرایہ لاہور کے معیار سے تقریباً چار ہزار روپیہ ماہوار ہوگا۔ اس کے اندر بجلی اور پانی کا معقول انتظام تھا۔ ساتھ ہی ایک وسیع اور صاف ستھرا جدید طرز کا باورچی خانہ تھا۔ جس کے اندر گیس کا چولھا موجود تھا۔ اور گیس بھی سلنڈر کے بجائے پائپ کے ذریعہ آرہی تھی۔ اور یہ سب کچھ امام صاحب کے لئے بالکل فری تھا۔

اگرچہ پاکستان کے تمام ائمہ کا معیار یہی نہیں ہے۔ تاہم اس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اور دل

سے دعا نکلی کہ کاش وہ دن آئے جب ہند و پاک کی تمام مسجدوں میں اسی طرح ائمہ کے لئے معقول تنخواہ اور صاف ستھری رہائش گاہ کا انتظام ہو۔ مساجد کے ائمہ کی حیثیت مسلم معاشرہ میں بے حد اہم ہے۔ مگر معاشی پستی کی وجہ سے ان کے اندر نہ اعلیٰ حوصلہ پیدا ہوتا اور نہ وہ اس قابل ہوتے کہ اعلیٰ سطح پر معاشرہ کی خدمت کر سکیں۔

لاہور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں قدیم ترین زمانہ سے درس قرآن کے سلسلے کثرت سے جاری رہے ہیں۔ لاہور کے ماہنامہ حکمت قرآن (ستمبر ۱۹۹۱) کے ایک مضمون میں "لاہور کے درس قرآن" کی تفصیل بتائی گئی تھی۔ اس کے مطابق، مولانا احمد علی صاحب غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۹۱۷ میں شیرانوالہ دروازہ کی ایک مسجد میں درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا، یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ مضمون کے مطابق، ۱۹۷۰ میں لاہور شہر کے اندر ۱۳۰ مقامات پر قرآن کا درس جاری تھا۔

اس پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ قرآن کے فوائد حاصل کرنے کے لئے یہی کافی نہیں ہے کہ قرآن کا درس مسجدوں میں جاری کر دیا جائے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن کا درس اپنی صحیح صورت میں دیا جا رہا ہو۔ چودھری غلام احمد پرویز بھی اپنی آخر عمر تک گلبرگ میں قرآن کا درس دیتے رہے۔ مگر تمام علماء کے نزدیک ان کا درس مفید نہ تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے فلسفہ کے مطابق یہ سمجھ لیا تھا کہ "نظام ربوبیت" قرآن فہمی کی روح ہے۔ وہ اپنے اسی فلسفہ کی روشنی میں قرآن کی تفسیر کیا کرتے تھے۔

ہر فکری کتاب کی طرح، قرآن کی بھی ایک شاہ کلید ہے۔ ضروری ہے کہ آدمی اس شاہ کلید کے تعین میں غلطی نہ کرے۔ ورنہ وہ قرآن کو سمجھنے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ قرآن فہمی کی شاہ کلید کوئی فن، کوئی نظریہ یا کوئی علمی نکتہ نہیں ہے، قرآن فہمی کی شاہ کلید تقویٰ ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ شرط موجود ہو وہ قرآن کو سمجھے گا۔ اور جس آدمی کے اندر یہ بنیادی شرط نہ پائی جائے وہ دوسری تمام خصوصیات کے باوجود بھٹک کر رہ جائے گا۔ وہ قرآن کا ماہر ہو کر بھی قرآن فہمی سے محروم رہے گا۔ اسی لئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: ھدیً للمتقین

کراچی (چاندنی چوک، ناظم آباد) کی محمدی مسجد کے خطیب جناب سید عبدالرؤف صاحب کو ایک تلخ تجربہ ہوا۔ انھوں نے ایک بار جامعہ کراچی میں قرآن کی تلاوت کی۔ تلاوت کے خاتمہ پر، عام قاریوں کے معمول کے خلاف، انھوں نے صدق اللہ العظیم نہیں کہا۔ اس پر ایک طالب علم نے انھیں ٹوکا اور کہا:

جناب، آپ ایک آیت چھوڑ گئے ہیں۔

جناب عبدالرؤف صاحب پر اس کا سخت ردعمل ہوا۔ ان کے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا کہ چوں کہ علماء اور قراء نے اختتام تلاوت پر صدق اللہ العظیم کہنا اپنا معمول بنا لیا ہے، لہٰذا اس تواتر عمل نے عام لوگوں کے ذہنوں میں یہ مغالطہ پیدا کر دیا ہے کہ شاید یہ الفاظ بھی قرآن کا مستقل حصہ ہیں۔ ان کا یہ احساس اتنا شدید ہوا کہ وہ تلاوت قرآن کے آخر میں اس کلمہ کے کہنے کو بدعت و گمراہی سمجھنے لگے۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلہ میں ایک سخت مضمون لکھا جو لاہور کے ماہنامہ حکمت قرآن (نومبر، دسمبر ۱۹۸۹) میں دو قسطوں میں چھپا۔

اس مضمون کی اشاعت کے بعد جوابی ردوکد ہوئی۔ یہاں تک کہ حکمت قرآن (مارچ ۱۹۹۰) میں مدیر محترم نے لکھا کہ یہ انتہا پسندانہ نقطۂ نظر ہے۔ اگر دور اول میں اس کا معمول نہ ہو تب بھی تلاوت قرآن کے آخر میں صدق اللہ العظیم کہنا بدعت اور گمراہی نہیں۔ یہ گویا اختتام تلاوت کی علامت ہے اور اس اعتبار سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

میں نے ایک صاحب سے گفتگو کے دوران کہا کہ مذکورہ طالب علم کی بات محض ایک انفرادی بات تھی، اس کو اتنی زیادہ اہمیت دینا اور اس کو عمومی گمراہی سمجھ کر اس پر بحث جاری کر دینا صحیح نہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے مذہبی حلقوں میں عام طور پر یہی ذہن چھایا ہوا ہے۔ اور اختلاف کا اصل سبب یہی مزاج ہے۔

وفاق پبلی کیشنز لاہور نے ۰۰ اصفحہ کی ایک کتاب چھاپی ہے۔ اس کا نام نفاذ اسلام: منزل بہ منزل ہے۔ روزنامہ وفاق کے پینل نے جناب مصطفیٰ صادق کی قیادت میں سابق صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق سے کئی انٹرویو لئے تھے۔ ان سب کو کتاب کی صورت میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اس کے صفحہ ۸۶ پر سابق صدر پاکستان کا ایک جواب نقل کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق، انھوں نے ایک سوال کے جواب میں جلسہ جلوس کی سیاست کو بے مقصد آگ بھڑکانا بتایا۔ انھوں نے کہا:

میرے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق، جلسہ اور جلوس وقت کا ضیاع ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس سے عوام کی تربیت پر غلط اثرات پڑ سکتے ہیں۔ اگر (جلسہ جلوس) کا یہ طوق کا اختیار کر لیا گیا تو اس کے اثرات اچھے نہیں ہوں گے۔ میں اس کے لئے موزوں الفاظ استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ کسی نے کہا ہے:

Political activities of procession and public meeting have generated more heat than light.

اس پرگفت گو کے دوران میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اس معاملہ میں ٹھیک یہی حالت ہندستان کی بھی ہے۔ یہاں بھی جلوس اور عوامی جلسوں کی صورت میں جو سیاسی سرگرمیاں جاری کی جاتی ہیں انھوں نے روشنی سے زیادہ گرمی پیدا کرنے کا کام کیا ہے۔ مثلاً سلمان رشدی کی کتاب کے مسئلہ پر بمبئی میں جلوس نکالا گیا اس نے ماحول میں صرف گرمی پیدا کی اور مسلمانوں کی قیمتی جانیں بے فائدہ طور پر ضائع ہوئیں۔ اسی طرح بابری مسجد کے مسئلہ پر جلسہ اور جلوس کے جو ہنگامے جاری کئے گئے اس نے بھی مسلمانوں کو کوئی روشنی نہیں دی۔ البتہ ماحول کے اندر جو گرمی پیدا ہوئی اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو مختلف قسم کے اندوہناک نقصانات اٹھانے پڑے۔

پاکستان کے سابق صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے پندرہ روزہ امپیکٹ (لندن) کو ایک انٹرویو دیا تھا۔ یہ انگریزی ہفت روزہ پاکستان کے اسلام پسند نوجوان نکالتے ہیں۔ انٹرویو زیادہ تر پاکستان میں اسلامی نظام اور جمہوریت سے متعلق تھا۔ اس کا ایک سوال و جواب یہ ہے:

Q: You are trying to reform democracy. Is it not necessary to reform the administrative structure as well so that it is able to run the Islamic system you are introducing?

A: I wish I can do that, but I don't think we can. I am sorry to say that if I tell... to start growing a beard, he will be the first to say no, because I myself do not keep a beard. (Radiance Weekly, April 12, 1981)

سوال: آپ پاکستان میں جمہوریت کی اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا یہ ضروری نہیں کہ انتظامی ڈھانچہ کی بھی اصلاح کی جائے تاکہ وہ اس اسلامی نظام کو چلانے کے قابل ہو سکے جس کو آپ ملک میں لا رہے ہیں۔

جواب: میری خواہش ہے کہ میں ایسا کر سکتا۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ اگر میں انتظامی کارکنوں سے کہوں کہ تم داڑھی رکھو تو وہ سب سے پہلے نہیں کر دے گا۔ کیوں کہ میں خود داڑھی نہیں رکھتا۔

اس انٹرویو کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ جنرل محمد ضیاء الحق کو پاکستان میں کامل اقتدار ملا۔ وہ ساڑھے گیارہ سال تک پاکستان کے مطلق حکمراں بنے رہے۔ اس کے باوجود ان

کے لئے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ وہ طاقت کے زور پر مکمل اسلامی نظام نافذ کر دیں۔

ایسی حالت میں جو لوگ آج تشدد کی تحریکیں چلا رہے ہیں تاکہ اقتدار پر قبضہ کر کے اسلامی نظام کو نافذ کریں، وہ یا تو انتہائی نادان ہیں یا انتہائی غیر سنجیدہ۔ ان دو کے سوا کوئی اور خانہ نہیں جس میں ان کو جگہ دی جاسکے۔

1991 کے الکشن کے بعد انڈیا کی پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں جو ممبران منتخب ہو کر آئے ہیں ان میں مسلم ممبروں کی تعداد ہمیشہ سے بہت کم ہے۔ اس پر یہاں کے مسلم حلقوں میں طرح طرح کے مایوسانہ تبصرے کئے جارہے ہیں۔ اس سلسلہ میں دہلی کے روزنامہ قومی آواز (9 ستمبر 1991) میں مسٹر دیش راج گوئل کے قلم سے ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے: "ملک کا سب سے زیادہ پریشان حال طبقہ"۔ مضمون نگار لکھتے ہیں:

سوال یہ ہے کہ کیا بھارتی پارلیمنٹ میں مسلمان ممبران کی زیادہ تعداد ان مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے جو بھارت میں انھیں درپیش ہیں۔ پاکستان کی قومی اسمبلی میں تو مسلمان ہی بھاری اکثریت میں موجود ہیں۔ پھر کیا یہ مسلم ممبران پاکستان کے مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔"

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ ہندو لیڈر کے یہ الفاظ مسلمانوں کے لئے چشم کشا حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کا مسئلہ "مسلم ممبران" حل نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا ہوتا تو پاکستان اور بنگلہ دیش میں مسلمانوں کے مسائل حل ہو چکے ہوتے۔ مگر وہاں بھارت سے بھی زیادہ سنگین مسائل موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسائل کے حل کے لئے ہمیں خود مسلم قوم کو تیار کرنا چاہئے۔ مسلم قوم میں جب تک تعمیری انداز میں فکری بیداری نہ لائی جائے، کوئی بھی دوسری تدبیر ان کے مسائل کو حل کرنے والی نہیں، خواہ بھارت کا معاملہ ہو یا پاکستان اور بنگلہ دیش کا معاملہ۔

اگست 1991 کے آخری ہفتہ میں جماعت اسلامی پاکستان نے اپنے "پچاسویں یوم تاسیس" کی تقریبات لاہور میں منعقد کیں۔ اس موقع پر جماعت اسلامی کے ذمہ داروں نے پرجوش تقریریں کیں۔ اخباری رپورٹ کے مطابق، ان تقریروں میں بڑی دلچسپ باتیں کہی گئیں۔ جماعت اسلامی پاکستان اپنے آٹھ ممبران اسمبلی کے ساتھ "اسلامی جمہوری اتحاد" کی حکومت میں شامل ہے۔ مگر جماعت کے

امیر قاضی حسین احمد صاحب نے اسلامی جمہوری اتحاد کے صدر اور پاکستان کے وزیر اعظم میاں نواز شریف پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ " میاں نواز شریف اپنے انتخابی منشور کو چھوڑ چکے ہیں۔ وہ اسلامی جمہوری اتحاد کا نام تو لیتے ہیں لیکن عملاً ان پر بھارتی لابی کی گرفت ہے۔"

پاکستان کی جماعت اسلامی کے سابق امیر میاں طفیل محمد صاحب نے اپنی تقریر میں پاکستان کے شریعت ایکٹ کو ایک منافقانہ قانون بتایا۔ انھوں نے کہا کہ اس شریعت ایکٹ نے گزشتہ (ایوبی) دور کے فیملی لاز کو بھی مات کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ " بھارت میں تو سابق وزیر اعظم (چندر شیکھر) نے مسلمانوں کو حقوق دے رکھے ہیں۔ خود پاکستان میں بھی تمام اقلیتوں کو حقوق حاصل ہیں۔ لیکن پاکستانی مسلمانوں کو حقوق حاصل نہیں " (روزنامہ وفاق، لاہور، ۲۸ اگست ۱۹۹۱، صفحہ ۶)

نوائے وقت (۳۰ اگست ۱۹۹۱) کے مطابق، جماعت اسلامی کے موجودہ اکابر کی تحریروں میں " دو قومی نظریہ، تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کا سارا کریڈٹ مولانا مودودی کو دیا گیا ہے۔" ایک طرف جماعت کے لوگ یہ کریڈٹ لینا چاہتے ہیں کہ انھوں نے پاکستان بنوا کر وہاں کے مسلمانوں کو محفوظ کر دیا۔ دوسری طرف وہی یہ بھی اعلان کر رہے ہیں کہ اس محفوظ خطہ میں بھی بھارت کی انتہائی طاقت ور لابی موجود ہے۔ اور یہ کہ پاکستانی مسلمانوں کو اتنا حق بھی حاصل نہیں جتنا بھارت میں بسے ہوئے مسلمانوں کو حاصل ہے۔ اسی بنا پر نوائے وقت (۳۰ اگست) نے ایک مضمون اس عنوان کے تحت چھاپا ہے کہ : جماعت والوں کی مت ماری گئی۔

ہندستان ٹائمس کے نمائندہ مسٹر بھابنی سین گپتا نے حال ہی میں پاکستان کا سفر کیا تھا۔ ان کی ایک رپورٹ ہندستان ٹائمس (۱۸ ستمبر ۱۹۹۱) میں چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے ---- بڑی کابینہ نواز شریف کی بقا میں مددگار :

Large cabinet helps Nawaz Sharif survive.

نواز شریف (اسلامی جمہوری اتحاد) اکتوبر ۱۹۹۰ کے الکشن کے بعد برسر اقتدار آئے تھے۔ پچھلے کچھ عرصہ سے مختلف پارٹیاں ان کے خلاف شور و غل کرتی رہی ہیں۔ ان کے سخت ناقدین میں جماعت اسلامی پاکستان بھی شامل ہے جو روایتی طور پر ان کی حلیف رہی ہے۔ مزید یہ کہ حال ہی میں اسلام آباد یونیورسٹی کے ایک سینئر استاد ڈاکٹر عنایت اللہ نے ۱۹۹۰ کے الکشن کے بارہ میں اپنا

جائزہ شائع کیا ہے۔ اس کے مطابق، تقریباً چالیس حلقۂ انتخاب میں واضح طور پر انتخابی دھاندلی کی گئی تھی۔

اس قسم کے مختلف واقعات سے مسٹر نواز شریف کی سیاسی حیثیت کمزور ہو رہی تھی۔ انھوں نے اس کا آسان حل یہ نکالا کہ مخالفین کو عہدے دے کر خاموش کر دیا۔ انھوں نے ۱۱ستمبر ۱۹۹۱ کو پاکستان کی مرکزی کابینہ میں توسیع کر کے ۲۹ نئے وزیروں کو اس میں شامل کر لیا۔ اس طرح اب ان کی کابینہ میں وزیروں کی مجموعی تعداد ۵۰ ہو گئی ہے۔

اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ کے انصار نے حکومتی عہدہ سے دستبرداری اختیار کر لی تھی۔ گویا اسلام کے دور اول میں حکومتی عہدہ چھوڑنے والوں نے اسلام کی تاریخ بنائی تھی، اب موجودہ زمانہ میں ایسے اسلام پسند ظاہر ہوئے ہیں جو حکومتی عہدوں پر قبضہ کر کے اسلام کی تاریخ بنانا چاہتے ہیں —— کیسا عجیب ہے یہ فرق جو ماضی اور حال کے درمیان پایا جاتا ہے۔

اسلام آباد کے انگریزی اخبار مسلم نے ۳۵ سالہ مہاجر لیڈر الطاف حسین کا ایک انٹرویو شائع کیا تھا۔ میں نے اس انٹرویو کی وہ نقل دیکھی ہے جو دہلی کے انگریزی اخبار انڈین اکسپریس (۱۲مارچ ۱۹۸۸) نے صفحہ ۸ پر شائع کی تھی۔ اس انٹرویو کے مطابق مہاجر لیڈر (قائد تحریک) نے کہا کہ ہندستان کی تقسیم کے وقت جو مسلمان ہجرت کر کے پاکستان گئے، ان کو اور ان کی اولاد کو پاکستان میں تیسرے درجہ کا شہری سمجھا جاتا ہے۔ ان کو آج بھی برابر کے حقوق حاصل نہیں۔ یہاں کے قدیم باشندے ان کو خارجی سمجھتے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں کسی بھی حکومت نے ان مہاجرین کو فرزند وطن کا درجہ نہیں دیا۔

مسٹر الطاف حسین کے الفاظ میں، پاکستان میں مہاجرین کو ملازمتوں کے معاملہ میں تحفظ حاصل نہیں ہے۔ وہاں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہاں ان کی کوئی شناخت نہیں۔ یہاں ہر شخص اپنے کو پٹھان پنجابی، سندھی، بلوچی کہتا ہے اور اردو بولنے والے مہاجران خانوں میں سے کسی خانہ میں نہیں آتے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کی تمام پارٹیاں علاقائی پارٹیاں ہیں جو مذکورہ چار قومیتوں میں سے کسی ایک قومیت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس بنا پر مہاجرین نے اپنی قومی تحریک شروع کی ہے تاکہ ان کو پانچویں

قومیت کی حیثیت سے پاکستان میں جگہ مل سکے۔

مسٹر الطاف حسین نے کہا کہ ہر مہاجر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے جائز حقوق کو نا جائز طریقہ سے سلب کر لیا گیا ہے۔ اور تعلیم، روزگار، ٹیلیویژن، حتی کہ کھیلوں تک میں ان کے ساتھ امتیاز کیا جاتا ہے۔ انھوں نے شکایت کی کہ مہاجروں کو کرکٹ کی ٹیم میں منتخب ہونے کا اہل نہیں سمجھا جاتا اور اگر بعض خوش قسمت ایسے ہیں جنھیں منتخب کیا گیا تھا تو ان کو عروج پر پہنچنے سے پہلے ریٹائر کر دیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ کراچی تک کی پولیس پنجابیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس محکمہ میں کسی مہاجر کو ملازمت نہیں دی جاتی۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ پاکستان اب اپنے قیام کی نصف صدی پوری کر رہا ہے۔ مگر وہاں کے اردو خواں مسلمانوں کے لئے بھی وہی مسائل ہیں جو ہندستان کے اردو خواں مسلمانوں کو پیش آرہے ہیں۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ ہندستان اور پاکستان یا ہندو اور مسلم کا نہیں ہے۔ بلکہ ذہنیت کا ہے۔ یہ دراصل ذہنیت ہے جو تمام مسائل پیدا کرتی ہے، اور دوبارہ یہ ذہنیت ہی ہے جو تمام مسائل کو ختم کرنے والی ہے۔ ایک لفظ میں —— تمام مسائل کا سبب غیر حقیقت پسندی ہے۔ اور تمام مسائل کا حل حقیقت پسندی۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہمارے یہاں اسلامی ذہن بنانے کے لئے بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر پچاس سالہ کوشش کے باوجود اب تک اسلامی انداز میں لوگوں کی ذہنی تربیت نہ ہوسکی۔ میں نے کہا کہ مجھے آپ کے بیان کے نصف ثانی سے اتفاق ہے۔ مگر مجھے اس کے نصف اول سے اتفاق نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اسلامی ذہن بنانے کی حقیقی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ پھر جس چیز کی کوشش ہی نہ کی گئی ہو وہ وجود میں کیوں کر آسکتی ہے۔

صرف اسلام کا نام لینے سے اسلامی تربیت نہیں ہوتی۔ اس کی ایک مثال دیتے ہوئے میں نے کہا کہ پاکستان کے پندرہ روزہ المنبر کے تازہ شمارہ ۲۵ ستمبر 1991 میں "ضیاء الحق شہید فاؤنڈیشن" کے زیر اہتمام ہونے والی کانفرنس کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ —— "ضیاء الحق فاؤنڈیشن کو فوری طور پر قوم کے کردار اور فکر کی تہذیب و تربیت کا کام شروع کرنا چاہئے"

مگر محض اس طرح اسلام کا نام لینے سے اسلامی فکر اور اسلامی کردار پیدا نہیں ہوسکتا۔

اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے کہ لوگوں کو حیات و کائنات کا اس طرح مطالعہ کرایا جائے کہ ان کے گرد و پیش کی پوری دنیا ان کے لئے رزق ربانی کا دسترخوان بن جائے۔ مثال کے طور پر المنبر کے مذکورہ شمارہ میں سابق صدر جنرل ضیاء الحق صاحب کے تذکرہ کے تحت درج ہے کہ "یہ شہید صدر ہی تھے جن کی بدولت قرآن مجید کے لاکھوں نسخے روس میں تقسیم ہوتے رہے۔" صفحہ ۲۲۔

یہ وہی واقعہ ہے جس کا ذکر الرسالہ نومبر ۱۹۹۰ (صفحہ ۲۷) میں کیا گیا ہے۔ الرسالہ میں سوویت سسٹم کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی اعلیٰ تدبیروں کے ذریعہ حالات میں وہ تبدیلی پیدا کی جس کے نتیجہ میں سوویت یونین کی آہنی دیواریں ٹوٹ گئیں اور وہاں اسلام کا داخلہ ممکن ہو گیا۔ دوسری طرف المنبر میں اسی واقعہ کو تمام تر ایک انسان کی بدولت ظہور میں آنے والا واقعہ بتایا گیا ہے۔

الرسالہ کے مضمون کو پڑھ کر آدمی کے اندر شکر خداوندی کا جذبہ امنڈ پڑے گا۔ مزید اس کے اندر یہ جذبہ ابھرے گا کہ موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں، اور ہم کو چاہئے کہ ہم ان کو استعمال کریں۔ جب کہ المنبر کے بیان سے صرف ہیرو ورشپ کا جذبہ ابھرے گا، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلامی تربیت کے لئے موجودہ انداز کلام کس طرح ناکافی ہے۔

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کا اتنا زیادہ چرچا ہے۔ اس کے باوجود لوگوں میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اسلام کے سارے معاملہ کو فخر کا معاملہ بنا دیا گیا ہے۔ اسلامی اسپرٹ تواضع کی اسپرٹ کا نام ہے۔ اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ فخر کی باتیں کبھی تواضع کا مزاج پیدا نہیں کرتیں۔

میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان سے ایک ماہنامہ "ہمدرد صحت" کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کا تازہ شمارہ ستمبر ۱۹۹۱ میں ایک مضمون "قرآن حکیم کی تکریم" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں کہا گیا ہے کہ قرآن شریف کی تعظیم یہ بھی ہے کہ دوران تلاوت اس کے مضامین کے لحاظ سے قلب میں پیدا ہونے والی کیفیات اور تاثرات کا بھی اندازہ کیا جائے۔ اگر

ذکر عذاب پر خوف طاری نہ ہو، اگر جنت کی بشارت پر بشاشت پیدا نہ ہو، اگر عظمت و کبریائی کے ذکر سے دل مائل بہ سجود نہ ہو تو اس کی تکریم کا حق ادا نہیں ہوا (صفحہ ٦)

یہ بات بظاہر درست ہے۔ مگر مضمون کے آخر میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے اس بات کی نفی ہو جاتی ہے۔ آخر میں کہتے ہیں کہ: قرآن حکیم وہ دولت دارین ہے جس پر ہمیں فخر بھی کرنا چاہئے۔ اس امت کے لئے سب سے بڑا شرف اور اس کے لئے سب سے بڑا سرمایۂ افتخار قرآن شریف ہے (صفحہ ١١)

یہ انسانی نفسیات کے سراسر خلاف ہے۔ قرآن کو اگر آپ مسلمانوں کے سامنے فخر کی کتاب کی حیثیت سے پیش کریں اور اس کو ان کے لئے سرمایۂ افتخار بتائیں تو اس کے بعد اس احساس کا ابھرنا ناممکن ہو جاتا ہے جو تمام اصلاحات کی جان ہے۔ یعنی خوف خدا۔ جس چیز کو آدمی اپنے لئے فخر کا سامان سمجھ لے اس کے تصور سے اس کے اندر ناز کی کیفیت تو ابھر سکتی ہے مگر اس کے تصور سے اس کے اندر احتساب خویش کی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

لاہور میں جو دینی حلقے ہیں ان میں سے ایک حلقہ وہ ہے جو مولانا جاوید احمد غامدی کی سربراہی میں قائم ہے۔ یہ سب کے سب نوجوان لوگ ہیں۔ ان کی اہم ترین صفت یہ ہے کہ وہ سب کے سب نہایت سنجیدہ ہیں۔ یہاں کے زمانہ قیام میں ان حضرات سے کئی بار انفرادی اور اجتماعی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کی سنجیدگی اور ان کے اسلامی ذوق کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

ان حضرات سے جو باتیں ہوئیں ان کو نقل کرنا ممکن نہیں۔ تاہم ایک چیز جس پر میں نے سب سے زیادہ زور دیا وہ دعوت ہے۔ میں نے کہا کہ دعوت الی اللہ ایک لازمی فریضہ ہے جو ہر حال میں اسی طرح اہل اسلام پر عائد ہوتا ہے جس طرح کہ نماز روزہ۔ فرق صرف یہ ہے کہ نماز روزہ ہر ہر فرد پر فرض ہے اور دعوت الی اللہ کی حیثیت فرض کفایہ کی ہے۔ یعنی کچھ لوگ اس کو ادا کر دیں تو پوری امت سے یہ فریضہ عملاً ساقط ہو جائے گا۔ ورنہ تمام امت ذمہ دار ٹھہرے گی۔

اس کام کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ مسلمان یا مسلمانوں کی پوری جماعت اصلاح یافتہ ہو جائے اس کے بعد اس کام کو انجام دیا جائے۔ دعوت سے مراد اسلام کی طرف دعوت ہے نہ کہ امت مسلمہ کی طرف دعوت۔ اس کا مطلب مدعو کو اس حقیقتِ واقعہ سے خبردار کرنا ہے کہ وہ اس دنیا میں

حالت امتحان میں ہے۔ موت کے بعد اس کا حساب لیا جائے گا اور اس کے بعد اس کے لئے یا تو ابدی جنت ہے یا ابدی جہنم۔ دعوت سے مراد انذار و تبشیر ہے۔ اور انذار و تبشیر میں ساری اہمیت پیغام رسانی کی ہوتی ہے۔ اس کے سوا بقیہ تمام چیزیں اضافی بن جاتی ہیں۔

ایک مجلس میں یہ سوال سامنے آیا کہ آدمی نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے۔ مگر اس کے اندر خوف خدا کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ اس کا سبب کیا ہے۔ جناب شیخ خاور محمود صاحب نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس کے مطابق زندگی نہیں گزارتے۔ یہ جواب اگرچہ سادہ تھا مگر مبنی بر حقیقت تھا۔

یہاں ایسے لوگ بڑی تعداد میں ہیں جو الرسالہ اور دوسری کتابوں کو پڑھتے رہے ہیں اور ہمارے مشن سے بخوبی واقف ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ایک صاحب نے اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ الرسالہ کے مطالعہ سے پہلے میرے اندر منفی سوچ تھی۔ اب الحمدللہ منفی سوچ مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے۔ اب میں نے پوری طرح مثبت سوچ کو اپنا لیا ہے اور اسی پر اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ایک نوجوان نے اپنی ڈائری دی اور کہا کہ اس میں کوئی چھوٹی سی نصیحت میرے لئے لکھ دیجئے۔ میں نے یہ جملہ لکھ دیا: دانش مند وہ ہے جو چھوٹی بات کو بڑی بات کے روپ میں دیکھ سکے۔

ایک طالب علم سے میں نے پوچھا کہ پاکستان کے جو ہندو نوجوان تعلیم میں مسلم نوجوانوں سے آگے ہیں اس کا راز کیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس سلسلہ میں مجھے خود تو ذاتی طور پر کوئی تجربہ نہیں۔ البتہ میرے ایک ٹیچر نے ایک بار کلاس میں یہی بات کہی۔ ہم لوگوں نے ان سے پوچھا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ ہمارے استاد نے کہا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ہندو طلبہ مشترکہ مطالعہ (combined study) کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کے علم سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اجتماعی مطالعہ کی بنا پر انہیں زیادہ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس مسلم طلبہ صرف انفرادی طور پر پڑھتے ہیں، ان کی معلومات کم رہتی ہیں۔ اس طرح ہندو آگے بڑھ جاتے ہیں اور مسلمان ان کے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

روزنامہ نوائے وقت (۲۴ ستمبر) میں ایک مضمون دیکھا۔ اس کا عنوان تھا: "ہندوؤں کی اسلام دشمنی" اس مضمون کا پہلا پیراگراف یہ ہے ـــــ یہ ایک ناقابل تردید اور اٹل حقیقت ہے جسے ہر پاکستانی کو مکمل طرح اپنے ذہن نشیں کر لینا چاہئے کہ پاکستان اور پاکستانیوں کا ازلی اور ابدی دشمن مسیحی نہیں، پارسی

نہیں، بدھ اور جین نہیں بلکہ ہنود، بروزن یہود ہیں" (صفحہ ۱۱)

ایک صاحب سے گفت گو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ یہ سراسر غیر داعیانہ انداز کلام ہے۔ اگر ہم اپنے کو داعی اور دوسری قوموں کو مدعو سمجھیں تو ہم تمام قوموں کو انسان کی نظر سے دیکھیں گے اگر بالفرض کوئی قوم زیادتی کرے تو اس کو نظر انداز کرکے اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کریں گے جیسا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔

عجیب بات ہے کہ اسی اخبار (نوائے وقت ۴ ستمبر) میں برطانیہ کی شہزادی ڈائنا کی تقریر چھپی ہوئی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ برطانی خاتون نے اسلام آباد میں تقریر کرتے ہوئے علامہ اقبال کے شعر کا حوالہ دیا۔ جنھوں نے کہا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو خدا سے محبت کرتے ہیں۔ وہ اس کی تلاش میں جنگل میں گھومتے ہیں۔ لیکن میں اس شخص سے محبت کروں گا جو خدا تعالیٰ کی تمام انسانیت سے پیار کرتا ہے۔ لیڈی ڈائنا نے کہا کہ اس شعر کے الفاظ دل کی گہرائیوں تک اثر کرتے ہیں اور میں اس کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہوں۔ (صفحہ ۶)

میں نے ایک صاحب سے اس خبر کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ محبت اپنے اندر تسخیری طاقت رکھتی ہے۔ دعوت کا سب سے بڑا ہتھیار محبت ہے۔ مگر اس دنیا میں محبت نام ہے یک طرفہ محبت کا۔ اس دنیا میں لازماً ایک کو دوسرے سے شکایت پیش آتی ہے۔ ایک کو دوسرے کی طرف سے زیادتی کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس دنیا میں وہی شخص محبت کر سکتا ہے جو شکایتوں اور زیادتیوں کے باوجود لوگوں سے محبت کرنے کا حوصلہ کر سکے۔

کرامت شیخ صاحب (پیدائش ۱۹۳۶) آٹومیٹک بک بائنڈنگ کی مشین اپنے یہاں لگانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے وہ لندن گئے۔ وہاں کی ایک کمپنی (Muller Martini) سے انھیں یہ مشین خریدنا تھا۔ کمپنی کے دفتر سے بات کرکے یہ طے ہوا کہ اس کا نمائندہ کرامت شیخ صاحب کی قیام گاہ پر آئے گا اور ان کو ساتھ لے جاکر شوروم میں مذکورہ مشین دکھائے گا۔

طے شدہ وقت پر کمپنی کا ایک انگریز نمائندہ گاڑی لے کر آیا اور شیخ صاحب کو اپنے ساتھ لے گیا تاکہ انھیں مذکورہ مشین دکھائے۔ راستہ میں گفت گو کے دوران اسلام زیر بحث آیا۔ اس نے کہا کہ یہ کیسا مذہب اسلام ہے۔ ایک شوہر اپنی بیوی پر زیادتیاں کرتا ہے، وہ مسلسل

پریشان کرتا رہتا ہے۔ مگر وہ عورت اپنے شوہر سے طلاق نہیں لے سکتی۔

کرامت شیخ صاحب نے کہا کہ آپ کو غلط فہمی ہے۔ ایسی عورت طلاق لے سکتی ہے۔ اسلام میں اس کی اجازت ہے۔ یہ سن کر وہ مبہوت ہوگیا۔ اس نے حیرانی کے ساتھ کہا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ ہم تو سمجھے ہوئے تھے کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح گفت گو ہوتی رہی۔ آخر میں اس نے کہا ـــــ جناب، آپ جیتے، میں ہار گیا۔

کرامت شیخ صاحب نے اپنا ذاتی تجربہ بتانے کے بعد کہا: موجودہ زمانہ میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسلام کا پیغام دوسری قوموں تک پہنچایا ہی نہیں گیا۔ اگر ہم صحیح طور پر اسلام کا پیغام جدید انسان تک پہنچائیں تو وہ چیخ اٹھے گا اور کہے گا کہ میں غلطی پر تھا، تم حق پر ہو۔ میں تمہارے دین کو قبول کرتا ہوں۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں دعوتی کام شروع نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ مسلمان اپنی "غلطی" ماننے کے لئے تیار نہیں۔ مسلمانوں کو پہلے یہ ماننا ہوگا کہ موجودہ زمانہ میں انھوں نے غلط تحریکیں چلائیں، اس کے بعد ہی ان کے درمیان صحیح دعوتی تحریک ابھر سکتی ہے۔

۲۱ ستمبر کو جناب مصطفی صادق (اڈیٹر انچیف روزنامہ وفاق) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بہت سے سبق آموز واقعات بتائے۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۸۵ میں وہ سابق صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کے ساتھ امریکہ گئے تھے۔ وہاں ہیوسٹن کی لیڈی میئر نے ضیاء الحق صاحب کے اعزاز میں ہوٹل (Inn on the park) میں پارٹی دی۔ جب لوگ میز کے گرد جمع ہوگئے تو امریکی میئر نے کہا کہ آج ہمارا مہمان ایک ایسا شخص ہے جو شراب نہیں پیتا۔ اور جس کے مذہب میں شراب حرام ہے۔ اس لئے ان کے احترام میں آج ہم نے یہاں شراب کا انتظام نہیں کیا ہے۔ مہمان حضرات اس کے لئے ہمیں معاف فرمائیں:

اگلے دن وہاں کے انگریزی اخبار ہیوسٹن ٹائمز (Huston Times) میں اس پارٹی کی خبر چھپی۔ اس خبر کی سرخی اخبار نے ان الفاظ میں قائم کی تھی ـــــ اسلام کے لمبے بازو ہیوسٹن تک پہنچ گئے:

Long arms of Islam reach Huston.

یہ سرخی علامتی طور پر اس امکان کو بتا رہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے ابدی طور پر رکھ دیا ہے۔ وہ یہ کہ اسلام کے بازو اتنے لمبے ہیں کہ امریکہ بھی اس کی زد سے باہر نہیں۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کے حق میں اس امکان کو بہت کم استعمال کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو سمجھا جائے اور اس کو پوری طرح استعمال کیا جائے۔

جنرل ضیاء الحق صاحب ساڑھے گیارہ سال تک پاکستان کے بااختیار صدر رہے۔ مگر انھوں نے اپنے لڑکوں کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔ ان کے لڑکے عام لوگوں کی طرح بینک وغیرہ میں سروس کرتے رہے۔ مگر ضیاء الحق صاحب کی وفات کے بعد ان کے دونوں لڑکے (اعجاز الحق، انوار الحق) نے انتخاب میں حصہ لیا۔ وہ بھاری ووٹوں سے کامیاب ہوئے۔ اب دونوں لڑکے مرکزی کیبنٹ میں منسٹر ہیں۔

عام طور پر بااختیار لوگ صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ اپنے اختیار کو استعمال کر کے اپنے بیٹوں کو اچھے عہدے دلادیں۔ مگر مذکورہ مثال بتاتی ہے کہ بیٹوں کو عہدہ نہ دلانا بھی انھیں بڑی چیز دینا ہے۔ ایسے لوگوں کے بچے خواہ اپنے والد کی زندگی میں ترقی کے درجات تک نہ پہنچیں مگر باپ کے بعد وہ ضرور اعلیٰ ترقیات تک پہنچ کر رہتے ہیں۔

کرامت بخش صاحب نے بتایا کہ سابق صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے ایک بار علماء کی میٹنگ بلائی۔ اس میں مولانا نورانی بھی تھے۔ وہ پان کھانے کے عادی ہیں۔ ان کے منھ میں پان دیکھ کر ضیاء الحق صاحب نے کہا کہ مولانا، آپ پان کھاتے ہیں، یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ مولانا نورانی نے کہا: آپ خود بھی تو سگرٹ (Dunhill) پیتے ہیں۔ ضیاء الحق صاحب نے یہ جملہ سننے کے بعد اسی وقت سگرٹ چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔ اور پھر ساری زندگی کبھی سگرٹ نہیں پیا۔

مسجد بلال (نیوگارڈن ٹاؤن)، بڑی خوب صورت مسجد ہے۔ اس میں امام اور موذن کے لئے رہائش گاہ بھی بنی ہوئی ہے۔ میں نے امام صاحب کی رہائش گاہ کو دیکھا۔ فلیٹ کے انداز کا ایک کشادہ مکان تھا۔ نہایت صاف ستھرا بنا ہوا۔ چپس کا فرش تھا۔ جدید طرز کا باورچی خانہ اور حمام وغیرہ اس کے اندر موجود تھے۔ پانی، بجلی اور پائپ گیس کے کنکشن بھی تھے۔

بہت سے لوگ ملیں گے جو یہ کہیں کہ مسجدوں کے امام حضرات کو معاشرہ کی اصلاح کا کام کرنا

چاہئے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ائمہ کو زیادہ فعال بنانے کے لئے ان کی معاشی حالت کو بہتر بنانا ضروری ہے۔ ائمہ کی معاشی حالت اگر عام طور پر بہتر ہو جائے تو ان کے اندر اعتماد اور حوصلہ پیدا ہوگا اور وہ معاشرہ کی اصلاح میں اپنا موثر کردار ادا کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ایک صاحب سے میں نے پوچھا کہ پاکستان میں جو اسلامی رسالے نکلتے ہیں، ان میں سے کون سا رسالہ ہے جو ہر حلقہ میں پڑھا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں تو ایسا کوئی رسالہ نہیں۔ یہاں جتنے اسلامی رسالے نکلتے ہیں وہ سب کسی حلقہ سے نکلتے ہیں اور اسی حلقہ میں پڑھے جاتے ہیں۔ یہاں اگر کوئی پرچہ ہر حلقہ میں پڑھا جاتا ہوگا تو وہ الرسالہ ہوگا۔

ایک نوجوان نے بتایا کہ یہاں انڈیا کی فلمیں پاکستانی فلموں سے زیادہ مقبول ہیں۔ انڈیا کو دوسرا ہالی وڈ کہا جاتا ہے۔ یہاں کے نوجوان کہتے ہیں کہ انگریزی ہالی وڈ امریکہ میں ہے اور اردو ہالی وڈ انڈیا میں۔ پاکستان کے سینما ہاؤسوں میں انڈیا کی فلم دکھائی نہیں جاتی۔ البتہ اس کے ویڈیو گھروں کے اندر وی سی آر پر بہت بڑے پیمانے پر دیکھے جاتے ہیں۔

گورنمنٹ فورمن کرسچین کالج یہاں کا بہت بڑا کالج ہے۔ اس کا رقبہ ۱۸۲ ایکڑ ہے۔ طلبہ کی تعداد چھ ہزار سے زیادہ ہے۔ ۲۴ ستمبر کی دوپہر کو یہاں کے آڈیٹوریم میں خطاب کے بعد اتنے زیادہ سوالات آئے کہ کاغذات کا ڈھیر لگ گیا۔ ایک سوال بہت صاف ہندی رسم الخط میں لکھا ہوا تھا۔ طلبہ کے جوش و خروش کو دیکھ کر میں نے کہا کہ آج میری سمجھ میں آگیا کہ یہاں کے لوگوں کے لئے کسی نے "زندہ دلان پنجاب" کا لفظ کیوں استعمال کیا تھا۔

عبد المجید صاحب ٹوکیو (جاپان) میں رہتے ہیں۔ ان کا ایک خط مورخہ ۶ ستمبر جناب محمد اسلم اُپل کے پاس دیکھا۔ اس میں انھوں نے جاپانیوں کے حالات لکھے تھے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ جاپانی بہت باکردار قوم ہیں۔ ان کے یہاں رشوت، سفارش، دھوکا، چوری، قتل وغیرہ کا نام تک نہیں۔ میں نے کبھی کسی مرد یا عورت کو کسی سے جھگڑتے نہیں دیکھا۔ ان کی زندگی کا مقصد یہ ہے — خود خوش رہو اور دوسروں کو خوش رہنے دو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ فطری اعتبار سے اس معیار اخلاق پر ہیں جس کو حدیث میں اس طرح بتایا گیا ہے کہ "مومن وہ ہے جو دوسروں کے لئے وہی پسند کرے جو وہ اپنے

لئے پسند کرتا ہے۔" گویا کہ وہ لوگ "۵۰ فیصد" دین خداوندی کے قریب آچکے ہیں۔ اب صرف "پچاس فیصد" مزید انھیں خدا کے دین کے قریب لانا ہے۔ اس کے بعد وہ یہ کہتے ہوئے خدا کے دین میں داخل ہو جائیں گے کہ "ہم تو پہلے ہی سے اس پر ایمان لائے ہوئے تھے"۔

جناب محمد اسلم اُپّل اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اسی کے ساتھ نہایت سنجیدہ ہیں۔ وہ ایک کالج میں استاد ہیں۔ وہ اس کے سخت خلاف ہیں کہ تعلیم گاہوں میں سیاست کو داخل کیا جائے۔ انھوں نے ایک ملاقات میں کہا کہ اگر ہماری تعلیم گاہوں کے طلبہ اور معلم سیاسی مزاج کے ہو جائیں تو اس کے بعد ہمیں کسی اور دشمن کی ضرورت نہیں:

We need not any enemy when teachers and the taught have been politicized.

مجھے ان لوگوں کے نقطہ نظر سے تو سخت اختلاف ہے جنھوں نے جدید درسگاہوں کو "قتل گاہ" بتایا۔ مگر جناب اسلم صاحب کی مذکورہ رائے سے مجھے صد فیصد اتفاق ہے۔ میری قطعی رائے ہے کہ تعلیم گاہوں سے یونین کا نظام اور سیاسی سرگرمیوں کو مطلق طور پر بند کر دینا چاہئے۔ طالب علمی کے زمانہ میں طالب علم کو صرف پڑھنا چاہئے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

ایک مجلس میں میں نے اسلام کی بنیادی تعلیمات اور دین کے بنیادی تقاضوں پر گفتگو کی۔ گفتگو ختم ہوئی تو ایک صاحب نے کہا کہ ——— " اور بابری مسجد کا مسئلہ" میں نے کہا کہ اجودھیا کی بابری مسجد کا مسئلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ویسا ہی ہے جیسا لاہور کی مسجد شہید گنج کا مسئلہ۔ حقیقت یہ ہے کہ بابری مسجد کا مسئلہ مسجد کا مسئلہ نہیں بلکہ مسجد کو سیاست بنانے کا مسئلہ ہے۔ جہاں کہیں بھی آپ کسی دینی معاملہ کو سیاسی استحصال (political exploitation) کا ذریعہ بنائیں گے تو وہی ہوگا جو بابری مسجد کے ساتھ ہوا۔

آپ کے لئے اس کی ایک قریبی مثال لاہور کی مسجد شہید گنج ہے۔ اس مسجد کو ۱۹۳۵ میں سیاسی استحصال کا ذریعہ بنایا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان بننے کے ۴۵ سال بعد بھی مسجد شہید گنج تعمیر نہ ہو سکی۔ اسی سے آپ اجودھیا کی بابری مسجد کے معاملہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ لاہور کی مسجد شہید گنج کا مسئلہ یہاں کے پرجوش لیڈروں نے پیدا کیا تھا۔ ٹھیک اسی طرح اجودھیا کی بابری مسجد کا مسئلہ

حقیقۃً ہندستان کے کچھ نااہل مسلم لیڈروں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ دونوں کا معاملہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل یکساں ہے۔

یہاں خطابات کے علاوہ روزانہ صبح وشام کثرت سے لوگ ملنے کے لئے آتے رہے اور ان سے گفتگو اور تبادلہ خیال جاری رہا۔ چوں کہ میری گفتگو کا سب سے زیادہ ابھرا ہوا موضوع دعوت ہوتا تھا، اس لئے سوال وجواب بھی اکثر براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسی سے متعلق تھے۔

کچھ لوگوں نے میرے دعوتی نقطۂ نظر سے اختلاف کیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ ہمارا سب سے پہلا کام مسلمانوں کی اصلاح ہے۔ دعوت کا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ ہم کو پہلے اپنے ملک میں اسلام کا نظام قائم کرنا ہے اس کے بعد قوموں کو اسلام کا مخاطب بنانا ہے۔ تیسرے صاحب نے کہا کہ سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت کو درست کیا جائے۔ اس کے بعد دعوت وغیرہ کا کام کیا جائے۔ چوتھے صاحب نے کہا کہ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم پہلے مسلم امہ کو تیار کریں، اس کے بعد یہ مسلم امہ دوسری قوموں پر دین کی گواہی کا کام انجام دے گی، وغیرہ۔

اس قسم کی تمام باتوں کو میں غلط سمجھتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ انذار وتبشیر کا پیغمبرانہ کام ان کی لازمی ذمہ داری ہے۔ کسی بھی عذر یا کسی بھی تاخیر کے بغیر انھیں اس کام کے لئے اٹھنا ہے۔ اور اپنی پوری طاقت کو خرچ کر کے اس کام کو انجام دینا ہے۔ اس کام کی فطری ترتیب یہ ہے کہ جن افراد کے اندر اس کا احساس پیدا ہو وہ افراد اس کام کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے دوسرے افراد بھی اٹھیں گے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آسکتا ہے کہ یہ کام اجتماعی سطح پر ہونے لگے۔

کچھ لوگوں نے کہا کہ مسلمان اس وقت ساری دنیا میں مسائل کے اندر گھرے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی کوشش انھیں مسائل سے نجات دلانے والی نظر نہیں آتی۔ میں نے کہا کہ یہ معاملہ کسی قوم کی سازش کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی اصل ڈیوٹی (دعوت الی اللہ) کو چھوڑ رکھا ہے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کا معاملہ سیدنا یونسؑ جیسا ہے۔ وہ دعوت کے محاذ سے ہٹ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو مچھلی نے نگل لیا۔ اسی طرح مسلمانوں کو مسائل نے نگل رکھا ہے۔ یہ حالت صرف اس وقت ختم ہوگی جبکہ

مسلمان اپنی غلطی کا احساس کریں اور دوبارہ دعوتی ڈیوٹی انجام دینے کی طرف پلٹ آئیں۔ اس کے علاوہ کسی بھی دوسری تدبیر سے یہ صورت حال ختم ہونے والی نہیں۔

لاہور کے زمانۂ قیام میں ہر روز خطابات کا پروگرام رہتا تھا۔ اس کی خبریں روزانہ اخباروں میں آتی رہیں۔ مگر اخباری رپورٹر چوں کہ خاص طرح کی زبان کے عادی ہو چکے ہیں، اس لئے بعض اوقات رپورٹنگ میں بڑی عجیب سی غلطیاں ہوئیں۔ مثلاً روزنامہ وفاق (۲۴ ستمبر) میں ایک تقریر کی رپورٹنگ میں یہ درج تھا کہ " مولانا نے کہا کہ اس وقت اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ لوگوں نے نماز روزہ ترک کر دیا ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کو دین کی روح سے بیگانہ کیا جارہا ہے (صفحہ ۱)

آجکل یہ مزاج ہے کہ ہر خرابی کا ذمہ دار حکومت کو بتا کر اس کی مذمت کی جاتی ہے۔ اس لئے رپورٹر کی زبان پر " بیگانہ کیا جارہا ہے " کا جملہ آگیا۔ حالاں کہ الرسالہ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ یہ میرا مسلک نہیں۔ میں نے اپنی بات " لازم " کے صیغہ میں کہی تھی، رپورٹر نے اس کو " متعدی " کے صیغہ میں تبدیل کر دیا۔

ایک صاحب سے صدام حسین اور ان کے پیدا کردہ خلیجی المیہ پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ مسلم تاریخ میں اتنی بڑی نادانی کی کوئی اور مثال مشکل سے ملے گی۔ اس کے باوجود مسلمانوں کی اکثریت ہر جگہ بشمول پاکستان صدام حسین کی حامی بن گئی۔ انھوں نے کہا کہ صدام حسین کا جرأتمندانہ انداز اور اس کا امریکہ اور اسرائیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولنا ایسا واقعہ تھا جس نے تمام مسلمانوں کو مسحور کر دیا۔ میں نے کہا کہ یہی مسلمانوں کی اصل کمزوری ہے۔ موجودہ مسلمان ایک الفاظ پسند قوم بن گئے ہیں۔ اور سیاسی لیڈران کی اسی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مگر الفاظ پسندی صرف زوال کی علامت ہے۔

امام مالک نے اپنی موطا میں قاسم بن محمد تابعی کا قول صحابہ کے بارے میں نقل کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو قول پر کچھ بھی خوش نہیں ہوتے تھے (ادرکت الناس وما یعجبون بالقول)

زندہ لوگ ہمیشہ عمل کو اہمیت دیتے ہیں اور مردہ لوگ الفاظ کو۔ صحابہ کرام زندہ لوگ تھے، اس لئے وہ عمل کو اہمیت دیتے تھے۔ موجودہ مسلمانوں میں زندگی نہیں۔ اس لئے وہ الفاظ کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں یہی ہمارا سب سے بڑا المیہ ہے۔ مسلمانوں کی یہی وہ کمزوری ہے

لاہور میں اجتماعی پروگرام

۲۰ ستمبر ۱۹۹۱	مسجد بلال نیو گارڈن ٹاؤن، خطبہ جمعہ سے پہلے تقریر، موضوع :	نماز کی حقیقت
	مسجد بلال گارڈن ٹاؤن، بعد نماز مغرب :	درس قرآن
	لاہور کے کچھ مسلم نوجوانوں سے ملاقات :	اسلامی جماعتیں
۲۱ ستمبر	قائداعظم لائبریری کے ہال میں خطاب :	اسلام اور عصر حاضر
	روزنامہ جنگ کے صدر دفتر کے ہال میں صحافیوں سے خطاب :	اسلام اور امن عالم
	پریس کونسل آف انٹرنیشنل افیرس کے تحت، ہلٹن ہوٹل :	صحابہ کرام کے کارنامے
	گارڈن ٹاؤن کے ایک مکان پر	درس حدیث
۲۲ ستمبر	قارئین الرسالہ سے ملاقات بر مکان کرامت شیخ صاحب :	تاثرات، سوال و جواب
	مسجد شان اسلام، گلبرگ میں خطاب :	اسلام کا عقیدۂ آخرت
	ہفت روزہ زندگی کی ٹیم سے تفصیلی انٹرویو :	ملت اسلامی کے مسائل
۲۳ ستمبر	روزنامہ نوائے وقت کے نمائندہ مسٹر عطاء الرحمٰن سے انٹرویو :	مسلمانان ہند کے مسائل
	ادارہ امور پاکستان کے ہال میں خطاب :	اسلام اور دنیا چیلنج
	ماہنامہ اشراق کے دفتر میں ملاقات :	مسائل حاضرہ پر گفتگو
۲۴ ستمبر	گورنمنٹ فورمن کرسچین کالج میں خطاب :	اظہار اسلام
	کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی مسجد میں خطاب :	دین کی حقیقت
	مسجد بلال، نیو گارڈن ٹاؤن میں بعد نماز مغرب :	درس حدیث
۲۵ ستمبر	نوجوانوں کے ایک حلقہ سے ملاقات :	موجودہ اسلامی تحریکیں
	گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن میں اساتذہ و طلبہ سے خطاب	عہد حاضر کا چیلنج
	مسجد بلال میں نماز مغرب کے بعد	درس حدیث
	جم خانہ کلب میں	آج کا انسان اور اسلام
۲۶ ستمبر	اخبار پاکستان کے نمائندہ مسٹر حفیظ قریشی سے انٹرویو	مسلمانان ہند کے مسائل
	نوجوانوں کے ایک اجتماع سے خطاب	توحید اور آخرت

جس نے انھیں استحصال پسند لیڈروں کی شکار گاہ بنا دیا ہے۔

کرسٹینا لیمب برطانیہ کی ایک خاتون جرنلسٹ ہیں۔ وہ فائننشل ٹائمس کی رسپانڈنٹ کی حیثیت سے کئی سال تک پاکستان میں رہی ہیں۔ پاکستان کے بارہ میں اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں انھوں نے ۳۰۰ صفحہ کی ایک کتاب تیار کی ہے۔ یہ کتاب لندن سے چھپی ہے:

Christina Lamb,
Waiting for Allah — Pakistan's Struggle for Democracy

وہ لکھتی ہیں کہ ابتداءً جب میں پاکستان آئی تو اس سے مجھے بہت دلچسپی ہوئی۔ میں نے اس کے بارہ میں بڑی بڑی امیدیں قائم کرلیں۔ مگر حقیقی تجربات نے مجھے اس کے بارہ میں مایوس کر دیا۔ خاص طور پر سیاسی کرپشن پاکستان کو اتنا زیادہ برباد کر چکا ہے کہ بظاہر اس کی ترقی کا کوئی امکان نہیں۔ ان کے خیالات کا خلاصہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے کہ —— آؤ ہم خدا پر بھروسہ کریں اور انتظار کریں کہ وہ ہم کو نجات دے گا۔ کیونکہ ہم خود یہ کام نہیں کرسکتے:

Let us have faith in Allah and wait for Him to redeem us, because we cannot do it ourselves.

کتاب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ پاکستان کے بارہ میں برطانوی خاتون کے احساسات اس کے معاند کے احساسات نہیں ہیں بلکہ اس کے دوست کے احساسات ہیں۔ تاہم میں نے ایک صاحب سے کہا کہ پاکستان کی موجودہ صورت حال کی ذمہ داری سب سے زیادہ جس کے اوپر آتی ہے وہ یہاں کا "اسلام پسند طبقہ" ہے۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد ان لوگوں نے نہایت غیر دانشمندانہ طور پر یہ کیا کہ وہ "اسلامائزیشن آف پاکستان" کا سیاسی جھنڈا لے کر کھڑے ہو گئے۔ حالاں کہ ان کے کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ اسلامائزیشن آف مین کے محاذ پر اپنی ساری قوتیں صرف کرتے۔ اگر وہ ایسا کرتے کہ ریاست کے معاملہ کو نارمل پولٹیکل پراسس کے حوالے کر دیتے اور خود فرد اور معاشرہ کی اصلاح کی مہم میں لگ جاتے تو یقینی طور پر پاکستان کی تاریخ اس سے مختلف ہوتی جو برطانی صحافی جیسے بہی خواہوں کو آج وہاں نظر آتی ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ مسلم دنیا کو ایٹمی طاقت بننا چاہئے۔ انھوں نے حوالہ دیا کہ لیبیا کے لیڈر

معمر قذافی نے عرب ملکوں سے کہا ہے کہ انھیں اگلے ۲۰ سال میں متحدہ طور پر ایٹمی ہتھیاروں پر مشتمل مزاحمتی طاقت بنانا چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ اگر لیبیا نے مناسب مقدار میں طاقت ور اسلحہ بنا لیا ہوتا تو پھر ہم ۱۹۸۶ میں امریکہ کی بم باری کا جواب دیتے۔ اگر ہمارے پاس نیویارک پہنچنے والے میزائل ہوتے تو اس بمباری کے جواب میں اسی وقت ہم اپنی فوجوں کو نیویارک پر میزائل پھینکنے کی ہدایت کرتے۔ اس لئے ہمیں یہ طاقت حاصل کرنا چاہئے تاکہ آئندہ امریکہ یا کوئی اور ہم پر دوبارہ حملہ کرنے کے بارے میں نہ سوچے (نوائے وقت، ۲۳ اپریل ۱۹۹۰)

میں نے کہا کہ ہتھیار کی جس طاقت کو معمر قذافی حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ سوویت روس کے پاس بھاری مقدار میں موجود تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے ہتھیار کو اپنے دشمن امریکہ پر استعمال کرنے کے لئے اپنے آپ کو عاجز پایا۔ چنانچہ اس نے امریکہ پر میزائل مارنے کے بجائے اس سے مصالحت کی بات چیت کی۔ حتی کہ اس مصالحت کو ممکن بنانے کے لئے اس پر راضی ہو گیا کہ وہ اپنے ہتھیاروں کو برباد کر دے۔

مختلف واقعات نے ثابت کیا ہے کہ آج دنیا اس حد تک بدل چکی ہے کہ اب تشدد کی طاقت نے اپنی اثر انگیزی کھو دی ہے۔ آج تشدد کی طاقت کے مقابلہ میں امن کی طاقت زیادہ موثر ہے۔

اس معاملہ کی ایک مثال جاپان ہے۔ جاپان نے صنعتی اعتبار سے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ مگر جاپان کے پاس آج بھی کوئی قابل ذکر فوجی طاقت نہیں۔ مگر جاپان کی تعمیری ترقی امریکہ کے لئے زیادہ بڑا خطرہ بن گئی ہے۔ امریکہ میں اوپی نین پول سے معلوم ہوا ہے کہ بیشتر امریکی روس کی فوجی طاقت کے مقابلہ میں جاپان کی صنعتی اور اقتصادی طاقت کو اپنے لئے زیادہ بڑا خطرہ سمجھتے ہیں۔

ٹائم (۳۰ اپریل ۱۹۹۰) نے ایک اوپی نین پول میں اپنے امریکی قارئین سے پوچھا کہ :

Was the U.S. right or wrong to get involved in the Vietnam War?

اس سوال کے جواب میں ۲۹ فی صد امریکیوں نے کہا کہ امریکہ اپنے اس اقدام میں رائٹ تھا اور ۵۷ فی صد امریکیوں نے کہا کہ امریکہ اپنے اس اقدام میں رانگ تھا۔ یہ ویٹ نام جنگ ختم ہونے کے پندرہ سال بعد کا جواب ہے۔ ویٹ نام کی جنگ (۷۵ - ۱۹۶۵) میں امریکہ کے ۵۸۰۲۲ مرد اور عورت ہلاک ہوئے۔ ویٹ نام کی جنگ ۱۹۶۵ سے ۱۹۷۵ تک جاری رہی۔

ٹائمس آف انڈیا (۳۰ ستمبر ۱۹۹۱) میں یہ خبر دی گئی ہے کہ مولانا عبدالقادر آزاد کو کچھ لوگ نشانہ تنقید بنا رہے ہیں جنھوں نے شہزادی ڈائنا کو بادشاہی مسجد میں داخل ہونے کی اجازت دی تھی۔ مخالفین کا کہنا ہے کہ شہزادی ڈائنا جس وقت مسجد کے اندر داخل ہوئیں ان کی ٹانگیں کھلی ہوئی تھیں، اور یہ اسلام کی رو سے جائز نہیں۔ مولانا عبدالقادر آزاد نے اس کے جواب میں کہا کہ اسلام کا یہ اصول مسلم عورتوں کے لئے ہے نہ کہ غیر مسلم عورتوں کے لئے۔

خبر میں بتایا گیا ہے کہ لاہور کے ایک وکیل کی معرفت کچھ لوگوں نے مولانا عبدالقادر آزاد کے خلاف ایک فوجداری کیس (criminal complaint) دائر کر دیا ہے۔ خبر میں یہ اشارہ ہے کہ اس کے پیچھے اصل میں سیاسی مقصد ہے۔ مولانا عبدالقادر آزاد وزیر اعظم نواز شریف سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ نواز شریف کے مخالفین اس واقعہ کو وزیر اعظم کو بدنام کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام کو سیاسی مقصد کے لئے استعمال کرنے کی یہ سیاست مسلمانوں میں بہت عام ہے۔ مگر وہ بہت بڑا گناہ ہے اور مسلمانوں کو آخری حد تک اس سے بچنا چاہئے۔

لاہور کے ایک اخبار کے نمائندہ انٹرویو لینے کے لئے آئے۔ انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں دریافت کیا۔ ان کے ہاتھ میں دہلی کا انگریزی ماہنامہ "مسلم انڈیا" تھا۔ میں نے کہا کہ آپ ہندستانی مسلمانوں کی حالت اسی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ہندستان کا مسلمان اپنے ماہنامہ کا نام "مسلم انڈیا" رکھتا ہے اور برسوں سے اس کو نکال رہا ہے۔ مگر اس کو کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ اس کے برعکس پاکستان کے ہندو اگر "ہندو پاکستان" کے نام سے اپنا ماہنامہ نکالیں تو مجھے امید نہیں کہ یہاں وہ اس کو نکالنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

میں نے کہا کہ ہندستان میں ہم کو مکمل آزادی ہے۔ وہاں "ہندستان میں اسلام کا غلبہ" (موومنٹ اگست ۱۹۹۱) کے عنوان سے مضامین چھپتے ہیں۔ حالاں کہ پاکستان میں ہندوؤں کے لئے ناممکن ہے کہ وہ " پاکستان میں ہندو ازم کا غلبہ" کے عنوان سے مضامین چھاپیں۔ لاہور کے ایک صاحب ہندستان جاتے ہیں اور وہاں یہ تقریر کرتے ہیں کہ ہم انڈر اسٹرگل کے ذریعہ اسلامی انقلاب برپا کریں گے۔ اور وہاں ان کی تقریر پر پابندی نہیں لگتی۔ حالاں کہ انڈیا سے ایک ہندو آکر یہاں تقریر

کرے کہ ہم ہتھیاروں کے زور پر ہندو نظام قائم کریں گے ، تو ناممکن ہے کہ وہ یہاں اس قسم کی تقریر کر سکے۔

انڈیا میں ۳ لاکھ مسجدیں ہیں۔ ان مسجدوں میں اسی طرح لاؤڈ اسپیکر پر اذان ہوتی ہے جس طرح پاکستان میں ہوتی ہے۔ وہاں ہر شہر اور ہر بستی میں لاکھوں کی تعداد میں مدرسے قائم ہیں۔ اور سب کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ مسلمان اسلام کے نام پر بڑے بڑے جلسے اور کانفرنسیں کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

انھوں نے کہا کہ "مسلم انڈیا" تو لکھتا ہے کہ مسلمان سرکاری ملازمتوں میں بہت کم ہیں۔ میں نے کہا کہ مسلم انڈیا آدھی بات لکھتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمان تعلیم میں دوسری قوموں سے بہت زیادہ پیچھے ہیں۔ اور جب تعلیم میں پیچھے ہیں تو سروسوں میں وہ برابری کا درجہ کس طرح پا سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر ہندستان میں ہندو مسلم فساد کیوں ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اسی بنا پر جس بنا پر پاکستان میں مسلم مسلم فساد ہوتے ہیں۔ دونوں کا سبب ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے صبر و اعراض نہ کرنا۔

مجھے اشتیاق تھا کہ لاہور کے اس تاریخی مقام کو دیکھوں جو "مسجد شہید گنج" کے نام سے مشہور ہے۔ ۲۱ ستمبر کی شام کو جناب کرامت شیخ صاحب کے ساتھ اس کو دیکھا۔ یہ مقام یہاں کے مشہور نولکھا بازار میں واقع ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہماری گاڑی نولکھا بازار کی تنگ گلیوں میں داخل نہیں ہو سکتی۔ ہم نے گاڑی کو باہر سڑک پر چھوڑ دیا اور نولکھا بازار میں داخل ہو کر پیدل روانہ ہوئے۔ پر ہجوم گلی سے گزرتے ہوئے آخر کار ہم وہاں پہنچے جہاں مذکورہ عمارت واقع ہے۔

وہاں پہنچ کر سب سے پہلا عجیب منظر جو دکھائی دیا وہ عمارت کے مقام داخلہ پر لگا ہوا بورڈ تھا اس بورڈ پر انگریزی اور اردو میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے : گوردوارہ شہید گنج سنگھیاں۔ گویا بورڈ کے اعتبار سے یہ عمارت مسجد نہیں ہے بلکہ گوردوارہ ہے۔

یہ مقام اس وقت پاکستان وقف بورڈ کے تحت ہے۔ یہاں بورڈ کی طرف سے ایک صاحب چوکیدار کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا نام عادل بادشاہ (۵۴ سال) بتایا۔ انھوں نے کئی عبرت انگیز باتیں بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ تقریباً ڈیڑھ سال پہلے یہاں انڈیا کے ایک مسلمان آئے۔ ان کی عمر تقریباً ۷۰ سال تھی۔ وہ اندر داخل ہوئے تو صحن میں پہنچ کر بری طرح رونے لگے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جب انگریز پولیس نے

مسلمانوں پر گولی چلائی تھی، اس وقت میں یہاں موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے مسلمان یہاں جمع ہیں اور اندر داخل ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن انگریز پولیس نے ایک نشان کر دیا تھا کہ اس حد سے آگے کوئی نہ بڑھے۔ مسلمان نہایت جوش میں تھے۔ وہ بڑھ کر اس حد کو پار کرتے۔ میں نے دیکھا کہ ایک مسلمان آگے بڑھا۔ پولیس نے گولی چلائی۔ اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ دوسرا مسلمان آگے بڑھا۔ دوبارہ پولیس نے گولی چلائی۔ اور اس کی لاش وہیں گر پڑی۔ اس طرح بارہ آدمی بڑھے اور سب کے سب گولی کھا کر گرتے رہے۔ اس کے بعد مجھے دیکھنے کی تاب نہ رہی۔ میں وہاں سے ہٹ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کے بعد کیا ہوا۔

خدا بخش لائبریری جرنل کے حوالے سے ہفت روزہ نقیب (پٹنہ) کے شمارہ ۹ ستمبر ۱۹۹۱ میں ایک دستاویز شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب لنڈا بازار میں دو سو سال پہلے ایک مسجد تعمیر ہوئی جو مسجد عبد اللہ خاں کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کو لاہور کے کوتوال عبد اللہ خاں نے بنوایا تھا۔ سکھوں کی شورش کے زمانہ میں پنجاب کے مغل گورنر نے ان کی سرکوبی شروع کی۔ مسجد کے قریب ہی کوتوالی میں سکھ مجرموں کو سزا دی جاتی تھی۔ اسی زمانہ میں ایک سکھ لیڈر تارو سنگھ یہیں مارا گیا۔

اس کے بعد جب سکھوں کا راج آیا تو انھوں نے مسجد پر قبضہ کر لیا اور اس کے قریب تارو سنگھ کی یاد میں ایک سمادھی بنا دی۔ جون ۱۹۳۵ میں سکھوں نے فیصلہ کیا کہ مسجد عبد اللہ خاں (جو اب مسجد شہید گنج کہی جاتی تھی) کو ڈھا کر وہیں گوردوارہ بنایا جائے۔ اس پر مسلمانوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ مسلم رہنماؤں کا ایک وفد انگریز گورنر سے ملا لیکن اس کی شنوائی نہیں ہوئی۔ اور برطانی سنگینوں کی حفاظت میں سکھوں نے مسجد کو گرا دیا۔

اس پر مسلمانوں کا بہت بڑا جلوس نکلا جو اندرون شہر سے دہلی دروازہ کے باہر پہنچا۔ یہاں پولیس نے صف بندی کی۔ مگر جلوس صف بندی کو توڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے بعد پولیس اور فوج کے ساتھ مسلمانوں کا خونیں تصادم شروع ہوا جو ۴۸ گھنٹے تک جاری رہا۔ دو دن کے اندر دس بار گولی چلی۔ تیرہ نوجوان ہلاک ہوگئے اور سیکڑوں مسلمان زخمی ہوئے۔ گورنمنٹ نے مسجد کے انہدام سے پہلے ہی مسلمانوں کے لیڈر ظفر علی خاں وغیرہ کو پکڑ کر جیل میں بند کر دیا تھا۔

انگریزی حکومت نے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے مال روڈ پر مسجد شاہ چراغ کو واگزار کردیا جو تقریباً ۷۵ سال سے انگریزوں کے قبضہ میں چلی آرہی تھی۔ مگر مسلمان اس پر راضی نہیں ہوئے۔ مجلس اتحاد ملت کے نیلی پوش رضاکاروں نے سول نافرمانی شروع کر دی۔ ہزاروں نوجوان جیلوں میں چلے گئے۔ مسلمانوں کے تمام لیڈر بھی قید میں تھے۔ ایک نوجوان ابوسعید انور اور اس کے ساتھی بادشاہی مسجد کو اڈا بنا کر حکومت کے خلاف تحریک چلا رہے تھے۔

اسی کے ساتھ لاہور کی دو مسلم جماعتوں کے درمیان معرکہ گرم ہو گیا۔ دہلی دروازہ کے باہر سرخ رنگ کی دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جو شخص ادھر سے گزرتا، احراری اس کی قمیص اتار کر سرخ رنگ میں رنگ دیتے۔ دوسری طرف موچی دروازہ کے باہر نیلے رنگ کی دیگیں تیار رہتی تھیں۔ یہاں لوگوں کے کرتے نیلے رنگ میں رنگے جا رہے تھے۔ بازاروں میں سرخ پوش اور نیلی پوش کثرت سے نظر آرہے تھے۔

مجلس احرار کا نشان سرخ رنگ تھا اور مجلس اتحاد ملت کا نشان نیلا رنگ۔ مسجد شہید گنج کی تحریک کے زمانہ میں ان دونوں کا جوش اپنے شباب پر پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ وہ عام مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر ان کے کپڑے اپنے پسندیدہ رنگ میں رنگنے لگتے تھے۔ اس نے مسجد شہید گنج کے مسئلہ کو تو حل نہیں کیا۔ البتہ اس جنونی عمل کے نتیجے میں مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان ناقابل بیان نفرت پیدا ہو گئی ــــــ یہی انجام موجودہ زمانہ کی تمام مشہور مسلم تحریکوں کا ہوا ہے۔

قرآن میں حکم ہے کہ اللہ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں ان پر سب وشتم نہ کرو، ورنہ یہ لوگ حد سے گزر کر جہالت کی بنا پر اللہ کو سب وشتم کرنے لگیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کی نظر میں اس کے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے، پھر ان سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ اس وقت اللہ انھیں بتا دے گا جو وہ کرتے تھے (الانعام ۱۰۹)

علماء نے کہا ہے کہ اس آیت کا حکم اس امت پر ہر حال میں باقی ہے۔ جب بھی اہل باطل طاقتور حیثیت میں ہوں اور یہ اندیشہ ہو کہ اسلام پر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یا اللہ پر سب وشتم کیا جائے گا تو کسی مسلمان کے لئے جائز نہ ہوگا کہ وہ ان کی صلیب کو یا ان کے دین کو یا ان کے عبادت خانہ کو برا کہے اور نہ کوئی ایسا فعل کرے جس کا یہ نتیجہ نکلنے والا ہو۔ کیونکہ یہ ان کو معصیت پر ابھارنے کے ہم معنی ہے (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۶۱/۷)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں ایسے ہر اقدام سے منع کیا گیا ہے جو الٹا نتیجہ (کاؤنٹر پروڈکٹو)

ثابت ہونے والا ہو۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے بڑے پیمانہ پر یہ فعل انجام دیا ہے۔ مسجد اقصیٰ (۱۹۴۸) سلمان رشدی (۱۹۸۹)، شاہ بانو بیگم (۱۹۸۵)، بابری مسجد (۱۹۸۶) وغیرہ مسائل پر جو دھواں دھار تحریکیں چلائی گئیں وہ سب اسی کے تحت آتی ہیں۔ ان تحریکوں سے کوئی بھی مثبت فائدہ نہیں ملا۔ البتہ ان کا یہ ناقابل تلافی نقصان ہوا کہ ساری دنیا میں اسلام سے نفرت پیدا ہو گئی۔ دین رحمت، لوگوں کی نظر میں صرف دین تشدد بن کر رہ گیا۔

۲۶ جنوری ۱۹۳۸ کو لاہور ہائی کورٹ نے مسجد شہید گنج کے مقدمہ میں مسلمانوں کے خلاف فیصلہ دیا۔ اگلے دن اسلامیہ کالج کے گراونڈ میں احتجاجی جلسہ ہو۔ اس کے بعد بادشاہی مسجد میں ایک جلسہ عام ہوا۔ شہر کے مختلف حصوں سے جلوس نکل رہے تھے۔ سب کی منزل بادشاہی مسجد تھی۔ مسجد مسلمانوں سے بھر گئی۔ مولانا ظفر علی خاں جلسہ کی صدارت کے لئے آئے۔ وہ منبر پر کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا: عزیزان ملت، میں تمہارے لئے ایک بشارت لایا ہوں۔ انھوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ہر طرف اللہ اکبر کے نعرے گونجنے لگے۔ بڑی مشکل سے انھوں نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا کہ آج میری آنکھوں نے یہ روح پرور منظر دیکھا کہ ہزاروں مسلم نوجوان ننگے سر اور دیوانہ وار سڑک پر چلے جارہے ہیں۔ ایک طالب علم کہتا ہے: تم کو کیا چاہئے (What do you want) اور پھر سب کے سب جواب دیتے ہیں: مسجد شہید گنج (Shahid ganj mosque) لوگو، جب کسی قوم کے نوجوان اس طرح فیصلہ کرلیں تو کوئی طاقت انھیں کامیابی سے روک نہیں سکتی۔

شورش کاشمیری نے اپنی کتاب "بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل" میں مسجد شہید گنج کا قصہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ اس کے کچھ حصے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

جولائی ۱۹۳۵ میں ایک دن ہنگامہ برپا ہو گیا کہ سکھ اس مسجد کو گرا رہے ہیں۔ پورا شہر بھڑک اٹھا۔ اس روز جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد مسلمانوں نے شہید گنج کا رخ کیا۔ ہزارہا مسلمان نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے شہید گنج کی طرف روانہ ہو گئے۔ سیکڑوں لوگ مسلح تھے۔ اور بعض نوجوانوں نے تیزاب کی پچکاریاں بھری ہوئی تھیں۔ میں بھی تماشائی کے طور پر ساتھ ہو گیا۔

جلوس شہید گنج کے چوک پر پہنچا تھا کہ اسی وقت گھڑ سوار پولیس آگئی۔ پیادہ پولیس بھی کافی تعداد میں تھی۔ سٹی مجسٹریٹ نریندر سنگھ نے آتے ہی مسلمانوں پر لاٹھی چارج کا حکم دے دیا۔

سکھوں نے شہید گنج کی بالکونی سے "راج کرے گا خالصہ" کے نعرے بلند کئے۔ مسجد بدستور گرتی رہی اگلی صبح تک مسجد کا نام ونشان نہ تھا۔ جب لاٹھی چارج کافی نہیں ہوا تو پولیس نے گولی چلائی جس میں بہت سے مسلمان ہلاک ہوگئے۔ دو دن متواتر مسلمانوں نے گولیاں کھائیں۔

اس سے پہلے سکھوں نے گورودوارہ تحریک چلائی تھی۔ ان کی بے مثال قربانیوں کے بعد گورودوارہ ایکٹ بنا تو گوردوارے مہنتوں اور رگیانیوں سے لے کر گورودوارہ پربندھک کمیٹی کے سپرد کئے گئے۔ اس فہرست میں شہید گنج کو بھی شامل کیا گیا۔ نواب مظفر خاں نے سکھوں کا یہ حق تسلیم کرلیا اور انھیں کے دستخطوں سے شہید گنج سکھوں کو ملی تھی۔ مسلمان اپنا دعویٰ ہار چکے تھے۔ اب گیارہ بارہ سال بعد ان کا دعوائے ملکیت برطانوی قانون کے نزدیک بے معنی تھا۔ آخر کار مورچہ ختم ہوگیا۔

اسی زمانہ میں پیر جماعت علی شاہ نے اعلان کیا تھا کہ اگر شہید گنج مسجد مسلمانوں کے حوالے نہ کی گئی تو وہ شاہی مسجد کے مینار پر چڑھ کر چھلانگ لگادیں گے۔ مسلمان اس اعلان پر ہجوم اٹھے۔ مگر شاہی مسجد کے مینار سراپا انتظار بنے کھڑے رہے۔ پیر صاحب نے عذر تراشا کہ شاہی مسجد کا امام وہابی ہے، اور وہ آج تک وہاں کی مسجد میں نہیں گئے۔

اس کے بعد ریزولیوشن پاس ہوتے رہے۔ کانفرنسیں ہوتی رہیں۔ نعرے لگے۔ جلسے ہوئے۔ لطف یہ ہے کہ شہید گنج اب بھی اسی طرح پڑی ہے اور اسلامی سلطنت کے دور میں بھی وہ سکھوں کی ملکیت تسلیم کی جاتی ہے"

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے ہمیشہ منفی تحریکیں چلائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا عام مزاج منفی مزاج بن گیا۔ اب مسلمان ہمیشہ اس وقت جوش دکھاتے ہیں جب کہ مسئلہ "مسلم ورسس نان مسلم" ہو۔ جب نان مسلم نشانہ سے ہٹ جائے تو اس کے بعد مسلمانوں کا جوش عمل بھی ختم ہوجاتا ہے۔

یہی معاملہ خود ہندوؤں کا بھی ہے۔ ہندستان کے جو ہندو مسلمانوں کے خلاف جوش دکھاتے ہیں وہ اسی لئے ایسا کررہے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو ان کے نشانہ پر کھڑا کر رکھا ہے۔ اگر مسلمان اپنے آپ کو ان کے نشانہ سے ہٹالیں تو اس کے بعد ان ہندوؤں کا جوش بھی ختم ہوجائے گا۔ اور پھر اجودھیا کے "رام مندر" کا بھی وہی انجام ہوگا جو لاہور کی مسجد شہید گنج کا ہوا ہے۔

اس مزاج کا ایک دلچسپ مظاہرہ ستمبر ۱۹۹۱ میں ہوا ہے۔ دوردرشن پر بچوں کے ایک پروگرام میں کوئز (Quiz) کے دوران ایک ہندو بچہ سے پوچھا گیا کہ "شوبوائے" کی تاریخ کیا ہے۔ اس نے کہا کہ آزادی سے پہلے مسٹر جناح نے یہ لفظ مولانا ابوالکلام آزاد کے لئے استعمال کیا تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں میں دوردرشن کے خلاف ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ اس قول کی اصل ذمہ داری مسٹر جناح پر ہے۔ مگر مسلمانوں نے کبھی مسٹر جناح کے خلاف ہنگامہ نہیں کیا۔ البتہ یہی لفظ ٹی وی پر ایک ہندو بچہ نے دہرایا تو اس کے خلاف وہ ہنگامہ کرنے لگے۔ وہ یہ مطالبہ لے کر کھڑے ہو گئے کہ ٹی وی کے اس عملہ کو برطرف کیا جائے جس نے اس قسم کا کوئز ٹی وی پر دکھایا ہے۔

لاہور کے سفر کے لئے جب میرا رزرویشن ہوا تو اس کے مطابق، مجھے ۱۹ ستمبر کو وہاں جانا تھا اور ۲۶ ستمبر کو دہلی واپس آنا تھا۔ یہ مدت میرے لئے غیر معمولی طور پر زیادہ تھی۔ چنانچہ لاہور پہنچتے ہی یہ حال ہوا کہ میں دن گننے لگا۔ ایک ایک دن ختم ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ۲۶ ستمبر آگیا جب کہ مجھے یہاں سے روانہ ہونا تھا۔ ۲۶ ستمبر کی صبح کو جب میں اٹھا اور روانگی کی تیاری کرنے لگا تو ایسا محسوس ہوا کہ گویا میں سفر آخرت کی تیاری کر رہا ہوں۔

میں نے سوچا کہ جس طرح لاہور میں ایک ایک دن ختم ہو کر آخرکار ۲۶ ستمبر آگیا۔ اسی طرح دنیا میں بھی میرے ایک ایک دن گزر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آخرکار وہ لمحہ آجائے گا جب کہ دنیا سے نکل کر مجھے آخرت کی طرف سفر کرنا ہوگا۔ ایک مدت ختم ہوگئی۔ اسی طرح دوسری مدت بھی ختم ہوجائے گی۔ پہلی مدت کے خاتمہ پر انسانی سواری مجھے لاہور سے اٹھا کر دہلی پہنچا رہی ہے۔ دوسری مدت کے خاتمہ پر فرشتوں کی سواری آجائے گی اور مجھ کو دنیا سے نکال کر آخرت کے عالم میں پہنچا دے گی۔ کیسا عجیب ہے وہ وقت جو آچکا، کیسا عجیب ہے وہ وقت جو آنے والا ہے۔

۲۶ ستمبر ۱۹۹۱ کو پی آئی اے کی فلائٹ ۲۷۰ کے ذریعہ لاہور سے دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ ایرپورٹ پہنچا تو معلوم ہوا کہ میری سیٹ کینسل ہوچکی ہے۔ دہلی سے اگرچہ میری واپسی کی سیٹ کنفرم تھی۔ مگر قاعدہ کے مطابق، مجھے اپنی سیٹ کو ری کنفرم کرانا چاہئے تھا۔ مگر میں نہ کرا سکا۔ اس بنا پر حسب قاعدہ میری سیٹ کینسل ہوگئی۔ مگر ایرپورٹ کے عملہ نے غیر معمولی تعاون دیا۔ مجھے سیٹ دوبارہ مل گئی۔

ایرپورٹ پر میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ روانگی کے اعلان کا انتظار کر رہا تھا۔ ان میں جناب

امیر العظیم صاحب (انچارج شعبۂ اطلاعات جماعت اسلامی پاکستان) بھی تھے۔ امیر العظیم صاحب کے ہاتھ میں ایک "موبائل ٹیلیفون" تھا۔ ٹیلی فون کا عام تصور یہ ہے کہ گھر یا آفس میں جہاں ٹیلی فون نصب ہو، وہیں سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ مگر موبائل ٹیلی فون ایک چلتا پھرتا ذریعہ رابطہ ہے۔ چنانچہ امیر العظیم صاحب کے دستی ٹیلی فون پر کئی بار گھنٹی بجی۔ انھوں نے لاہور کے اندر اور لاہور کے باہر مختلف مقامات سے اس طرح گفتگو کی جیسے کہ دونوں پاس بیٹھے ہوئے ہوں۔ امیر العظیم صاحب نے کہا کہ پہلے مجھ سے ربط قائم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ میں اپنے دفتر یا گھر میں موجود رہوں۔ اب میں خواہ جہاں بھی رہوں فوراً لوگوں کے ساتھ میرا رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔

یہ دیکھ کر مجھے قرآن کی وہ آیت یاد آئی جس میں بتایا گیا ہے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ تم سب کو لے آئیگا، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے (البقرہ ۱۴۸) اللہ کے لئے پوری طرح ممکن ہے کہ وہ مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے انسانوں سے ربط قائم کرے اور ان کو اپنے پاس بلائے۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کی ایجادات نے اس عقیدہ کو واقعاتی طور پر قابل فہم بنا دیا ہے۔

جہاز کے اندر داخل ہو کر میں اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا کہ جہاز کے عملہ کے ایک صاحب مسکراتے ہوئے میرے پاس آئے۔ ان کے ہاتھ میں لاہور کے اخبار وفاق (۲۶ ستمبر) کا شمارہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ اخبار "مولانا وحید الدین نمبر" کے طور پر نکالا گیا ہے۔ اس کی تصویروں سے میں نے سمجھا کہ وہ آپ ہی ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا: "آپ بزرگ آدمی ہیں۔ خصوصی دعائیں کریں ہمارے لئے۔ بہت برا حال ہے ہمارا۔" ان کے چہرہ پر داڑھی تھی۔ انھوں نے اپنا نام اکرام اللہ بتایا۔

اکرام اللہ صاحب کا یہ جملہ سن کر میرے سامنے وہ مناظر گھومنے لگے جو لاہور میں میرے ساتھ گزرے تھے۔ ایک صاحب سے میری ملاقات کرائی گئی۔ وہ کرتا اور پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ سر پر گول ٹوپی اور چہرہ پر داڑھی تھی۔ بظاہر وہ ایک مولوی معلوم ہوتے تھے۔ مگر تعارف کرانے والے نے بتایا کہ یہ ہمارے یہاں کے فلاں شعبہ کے ڈائرکٹر ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ کوئی چیف انجینئر تھا اور کوئی ڈاکٹر، کوئی پروفیسر تھا اور کوئی بہت بڑا تاجر۔ مگر اسی کے ساتھ دیندار اور اسلامی تشخص کو اپنائے ہوئے۔ اسی فہرست میں اکرام اللہ صاحب کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

میں نے سوچا کہ جب پاکستان میں ایسے قابل رشک دیندار موجود ہیں تو اکرام اللہ صاحب نے ایسا

مایوسن کن جملہ کیوں کہا۔ غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس کا اصل سبب موجودہ اخبارات ہیں۔ یہ اخبارات ملک کے اچھے واقعات کو نمایاں نہیں کرتے۔ وہ زیادہ تر برے واقعات کو اپنے صفحات میں نمایاں کرتے ہیں۔ عام آدمی جو صبح سے شام تک اپنے کام میں مشغول رہتا ہے، اس کے لئے اخبارات ہی ملکی حالات کو جاننے کا ذریعہ ہیں۔ اخباروں کا "زرد صحافت" کا انداز انھیں ملک کے حالات کے صرف ۵۰ فیصد سے باخبر کرتا ہے۔ بقیہ ۵۰ فیصد ان کے لئے لامعلوم بنا رہتا ہے۔ اس صورت حال نے سوچنے والے لوگوں میں غیر ضروری طور پر مایوسی کی نفسیات پیدا کر دی ہے۔ حالاں کہ وہ اصل حقیقت کے مطابق نہیں۔

جہاز میں لاہور کا انگریزی اخبار پاکستان ٹائمس (۲۶ ستمبر) دیکھا۔ اس کے صفحہ اول اور صفحہ آخر پر لیڈی ڈائنا کی رنگین تصویر تھی۔ اس کے علاوہ بھی اس میں موصوفہ کی بہت سی تصویریں تھیں۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ لیڈی ڈائنا جب بادشاہی مسجد پہنچیں تو وہاں کے امام مولانا عبد القادر نے ان کو قرآن کا ہدیہ پیش کیا اور سیرت رسول پر ایک کتاب انھیں عطا کی۔ تصویر میں دکھایا گیا تھا کہ امام صاحب سے قرآن کا ہدیہ لیتے ہوئے شہزادی ڈائنا نے اپنے سر کو دوپٹہ سے ڈھانک رکھا تھا۔ خبر کی سرخی ان الفاظ میں قائم کی گئی تھی:

Diana impressed by Lahore cultural heritage.

جہاز میں پی آئی اے کا میگزین ہم سفر (ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۹۱) موجود تھا۔ اس میں ایک مضمون کھیوڑہ کی نمک کی کانوں کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ دنیا میں نمک کے سب سے بڑے ذخائر پاکستان میں ہیں۔ یہاں کے پہاڑوں میں ایک ایسا طویل سلسلہ موجود ہے جو اندر سے مکمل طور پر نمک ہیں۔ ان پہاڑوں کو کوہستان نمک (سالٹ رینج) کہا جاتا ہے۔ دنیا میں نمک کے دوسرے سب سے بڑے ذخائر پولینڈ میں ہیں۔

نمک کی ان کانوں کو ماہرین نے "ارضیاتی عجائب گھر" کا نام دیا ہے۔ ماہرین ارضیات کا خیال ہے کہ نمک کے یہ پہاڑ تقریباً چار ارب سال پرانے ہیں۔ نمک کی یہ کانیں ۳۲۲ قبل مسیح میں سکندر اعظم کے زمانہ میں دریافت ہو چکی تھیں۔ کھیوڑہ میں سائنسی بنیادوں پر نمک کی کان کنی کا آغاز ۱۸۴۹ میں انگریزوں کے دور حکومت میں ہوا۔ کھیوڑہ کی کانوں سے ہر روز تقریباً ۲۰ ہزار من نمک نکالا جاتا ہے۔

مضمون میں بہت سی دلچسپ معلومات تھیں۔ نیز بتایا گیا تھا کہ جس مقام سے نمک کے ذخائر

کا سلسلہ شروع ہوتا ہے وہاں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ یہ دنیا میں اپنی نوعیت کی واحد مسجد ہے۔ اس مسجد کا فرش پورا نمک کا ہے۔ اس کی دیواروں میں جو اینٹیں لگی ہوئی ہیں وہ بھی سب نمک ہیں۔ یہ مسجد ۱۵ سال پہلے بنائی گئی تھی۔

۲۶ ستمبر ۱۹۹۱ کو میں دہلی واپس پہنچا۔ میں پاکستان میں صرف ویزا کی مدت کے بقدر رہ سکتا تھا۔ ہندستان میں میرے قیام کے لئے بظاہر اس قسم کی کوئی تحدید نہیں ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہاں بھی میرا ٹھہرنا ایک محدود مدت تک ہی کے لئے ہے۔ اس کے بعد میرے لئے آخری روانگی کا وقت آجائے گا۔ موجودہ سواری نے مجھے دہلی ایرپورٹ پر اتارا ہے، اگلی سواری مجھے کہاں اتارے گی، اس کا علم اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں ـــــ کیسا عجیب مرحلۂ حیات پیش آچکا ہے، کیسا عجیب مرحلۂ حیات پیش آنے والا ہے۔

الرسالہ کیسٹ — ارکانِ اسلام سیٹ

اس وقت ارکانِ اسلام کے نام سے کیسٹوں کا ایک سیٹ زیر تیاری ہے۔ جس کی ترتیب حسب ذیل ہے:

۱- حقیقتِ ایمان
۲- حقیقتِ نماز
۳- حقیقتِ روزہ
۴- حقیقتِ زکاۃ
۵- حقیقتِ حج

ایمان کے موضوع پر ابتدا ہی میں ایک کیسٹ تیار کیا جا چکا ہے۔ اب بقیہ چار موضوعات پر علاحدہ علاحدہ کیسٹ بنائے جا رہے ہیں جن میں عام فہم انداز میں اسلامی عبادات کی حقیقت اور ان کے تربیتی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ پورا سیٹ جلد ہی تیار ہو جائے گا۔

ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ □ ہدیہ فی سیٹ ۱۱۰ روپیہ

AL-RISALA CASSETTE C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

۱ ہندستانی اندولن کی طرف سے ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۳ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ایک سمینار ہوا۔ اس کا عنوان تھا: (Movement for National resurgence) منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ملک کی سیاسی اور سماجی برائیوں کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اہل ملک کو تعلیم یافتہ اور باشعور بنایا جائے۔

۲ پانچ جنیہ کے سب اڈیٹر مسٹر ایم اے بھرت نے ۳ اکتوبر ۱۹۹۳ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق مسلمانان ہند کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ ڈبل اسٹینڈرڈ بننا اسلام میں حرام ہے۔ اسلام میں یہ ہے کہ آدمی جو کہے وہی کرے اور جو کرتا ہے وہی بولے۔

۳ مسٹر للت کمار شرما نے ۳ اکتوبر ۱۹۹۳ کو آل انڈیا ریڈیو کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ۴ اکتوبر کی صبح کو آکاش وانی (میڈیم ویو) سے نشر کیا گیا۔ ایک سوال کے جواب میں انھیں بتایا گیا کہ ہمارا ایک ہی مشن ہے جس کو ہم ۲۵ سال سے چلا رہے ہیں۔ اور وہ یہ کہ زندگی کا راز ایڈجسٹمنٹ میں ہے۔ کامیابی اس کو ملتی ہے جو مشکلات کو نظر انداز کرے اور امکانات کو استعمال کرے۔

۴ صدر اسلامی مرکز نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ کو جگت گرو سوامی سروپانندجی سرسوتی، سنکراچاریہ آف دوارکا پیٹھ سے نئی دہلی میں ملاقات کی۔ ان سے بابری مسجد اور دوسرے ملکی مسائل پر تبادلۂ خیال ہوا۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز کی اس تجویز سے اتفاق کیا کہ جس طرح چاروں سنکراچاریہ کی میٹنگ سرنگیری میں ہوئی تھی، اسی طرح مخصوص علما کی ایک میٹنگ بلائی جائے تاکہ اس مسئلہ پر غور ہو سکے۔

۵ انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر کے اڈیٹر سیشادری چاری نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز سے طویل صحافتی ملاقات کی۔ ڈاکٹر مہیش شرما بھی ان کے ساتھ موجود تھے۔ مسلمان ہندو اور ملک کے بہت سے مسائل زیر بحث آئے۔

خلاف ہے۔ عرب ملکوں میں کچھ پرجوش تحریکوں نے مسجد کو مخالفانہ سرگرمیوں کا مرکز بنایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں مسجدیں صرف نماز کے وقت کھلتی ہیں اور نماز کے بعد فوراً بند کر دی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کو اس سے بچنا چاہئے کہ عرب ملکوں کی یہی مثال دوسرے ملکوں میں بھی دہرائی جائے۔

۱۰ مسٹر میک کیونس (Dalip MACcuns) نے ۳ اکتوبر ۱۹۹۳ کو دہلی کے انگلش میگزین راشٹریہ سہارا کے لئے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ انڈیا کوئی مستثنیٰ ملک نہیں۔ دنیا کے دوسرے ملکوں میں جس طرح مسلمان امن کے ساتھ رہتے ہیں اسی طرح وہ انڈیا میں بھی رہ سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ انڈیا میں بھی اسی طرح غیر احتجاجی انداز میں رہنے لگیں جس طرح وہ دوسرے ملکوں میں غیر احتجاجی انداز میں رہ رہے ہیں۔

۱۱ ہندی اخبار دینک جاگرن کے نمائندہ مسٹر وفا صاص نے ۲۸ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستان میں مسلمانوں کے موجودہ مسائل سے تھا۔

۱۲ بی بی سی کے نمائندہ مسٹر پرویز عالم نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔

۱۳ ہندی اخبار جن ستا کے نمائندہ مسٹر رام بہادر رائے نے ۲ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ ۱۸ اکتوبر کو دوردرشن پر جو کچھ کہا گیا وہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ یہ بات میں ۱۹۶۸ سے مسلسل کہتا رہا ہوں۔ اس کے لئے الجمعیۃ کا فائل اور الرسالہ کا فائل دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۴ نو بھارت ٹائمس کے نمائندہ مسٹر یشونت دیش مکھ نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا مفصل انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر ملک کے موجودہ حالات اور موجودہ مسلم مسائل سے تھا۔ یہ انٹرویو اور اس کی بنیاد پر اڈیٹوریل دونوں نو بھارت ٹائمس کے شمارہ ۲ نومبر میں شائع ہوئے ہیں۔

۶ سارناتھ (بنارس) کے ادارہ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ہائر تبتن اسٹڈیز :

Central Institute of Higher Tibetan Studies

میں ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۳ کو ایک انٹر ریلیجس ڈائیلاگ ہوا۔ اس کا موضوع تھا :

Plurality of Religions in the Contemporary World

اس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ بعض وجوہ سے وہ شریک نہ ہو سکے۔ تاہم اس موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے انھیں ایک پیپر بھیج دیا گیا۔

۷ مراکش کے ایک صحافی استاد الصادق ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۳ کو مرکز میں آئے۔ ان کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد جناب محمد ایوب صاحب بھی تھے۔ مراکش کے صحافی ہندستانی مسلمانوں پر ایک رپورٹ تیار کرنے کے لئے ہندستان آئے ہیں۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز سے اس سلسلہ میں تفصیلی گفت گو کی۔ انھیں بتایا گیا کہ ہندستان کے مسلمانوں کا معاملہ بھی ویسا ہی ہے جیسا دوسرے ملکوں کا معاملہ۔ یہاں کے مسلمانوں کو اسی طرح ہر قسم کی ترقی کے مواقع ملے ہوئے ہیں جس طرح دوسرے ملکوں میں ہیں۔ تاہم کسی بھی ملک میں ترقی اور کامیابی ہوش مندی کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے اور اسی طرح ہندستان میں بھی۔

۸ ہندی روز نامہ نیو بھارت ٹائمس کے نمائندہ مسٹر اسرار خاں نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع یہ تھا کہ مسجد کے اندر سیاسی سرگرمی اور مسلح سرگرمی کے بارہ میں اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ مسجد عبادت اور ذکر الٰہی کے لئے ہوتی ہے۔ چنانچہ مسجدوں میں یہ شعر لکھا رہتا ہے :

مسجد خدا کا گھر ہے عبادت کا کام ہے دنیا کی بات کرنا مطلق حرام ہے

۹ دور درشن (نئی دہلی) کی ایک ٹیم نے ۲۱ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ریکارڈ کی جو اسی دن نیشنل چینل پر دکھائی گئی۔ اس تقریر کا موضوع یہ تھا کہ اسلام میں مسجد کا حکم کیا ہے۔ اس میں بتایا گیا کہ مسجد ذکر اور عبادت یا اس سے براہ راست تعلق رکھنے والی خالص دینی سرگرمیوں کے لئے ہے۔ مسجد کو سیاست کا مرکز بنانا اسلامی تعلیم کے بالکل

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

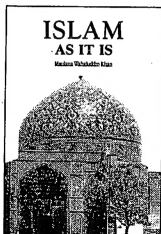
۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

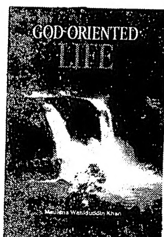
۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	£50 / $100	

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے ناس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا۔





ISLAM AS IT IS

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 114 Rs. 40

In *Islam As It Is,* Maulana Wahiduddin Khan presents the fundamental teachings of Islam in a manner which will appeal directly to both general readers and students of Islam.

Simple and straightforward in style, *Islam As It Is* gives the reader an accurate and comprehensive picture of Islam — the true religion of submission to God.

GOD-ORIENTED LIFE

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 186 Rs. 60

The traditions – Sunnah – of the Prophet Muhammad, upon whom be peace, and the lives of his companions and those closely associated with them, serve as a major source of religious enlightenment in theory and in practice. This book endeavours to present these ideas in the simplest and most direct way. In that it culls from authentic sources the sayings and deeds of the Prophet and those inspired by him, it brings to us a complete and, above all, human picture of true Islamic behaviour.

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر



AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel : 4611128, 4697333 Fax : 91-11-4697333